شامِ دوستاں آباد

وزیر آغا

مکتبۂ عالیہ، ایبک روڈ، لاہور

حقوق : بحقِ مصنّف محفوظ

طبع : اوّل

تعداد : ایک ہزار

ناشر : الطاف حسین

مطبع : ندرت پرنٹرز لاہور

خطاطی تمکین شیرازی

ماہ وسال اشاعت : جنوری ۱۹۷۶ء

قیمت : ۱۲/۵۰ روپے

شامِ دوستاں کے نام ـــــــ

شبِ سیاہ میں جس طرح کاہکشاں آباد
سدا رہے یہ مری شامِ دوستاں آباد

فہرس

چلو کہ ہم بھی شفق زار میں کہیں بیٹھیں
چلو کہ ہم بھی کریں شامِ خستگاں آباد

عجیب رنگ ہے اب کے خروشِ دریا کا
ہے سطحِ آب پہ اِک شہرِ بے نشاں آباد

میرے بچپن کا دوست

آج سے تقریباً پینتالیس برس پہلے کی بات ہے کہ ایک روز میرے والد کو نجانے کیا سوجھی کہ مجھے سیر کے بہانے گاؤں کے پرائمری سکول میں لے گئے اور پھر وہیں چھوڑ آئے میں سکول کی دیواروں پر بنی ہوئی تصاویر کو دیکھنے میں اس قدر منہمک تھا کہ والد صاحب کے چلے جانے کا مجھے علم تک نہ ہو سکا۔ اور جب علم ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں کسی لق و دق صحرا میں کھڑا ہوں اور میرے چاروں طرف پھیلی ہوئی زمین میں جلاد ایسی مونچھیں اُگ آئی ہیں۔ پھر دفعتاً یہ ساری مونچھیں سمٹ کر سکول کے ماسٹر صاحب کے بالائی ہونٹ کی محراب پر جمع ہو گئیں اور میں نے حیرت سے دیکھا کہ ان مونچھوں سے ذرا اوپر دو ویران سے غار منہ کھولے کھڑے تھے اور ان غاروں سے ذرا اوپر دو سُرخ انگارہ آنکھیں تیروں کی طرح اترتی میرے سارے بدن کو چھلنی کر رہی تھیں۔ چنانچہ حفاظتِ خود اختیاری کے تحت میں نے بے اختیار رونا شروع کر دیا اور آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے میرے گالوں پر لڑھکنے لگے۔ ان آنسوؤں کو دیکھتے ہی اُن لال انگارہ آنکھوں میں نفرت کی ایک تیز سی کٹار اُبھری جس نے میرے آنسوؤں کی طغیانی کو اور بھی تیز کر دیا۔ مگر عین اس وقت ماسٹر صاحب نے دائیں بائیں ایک نظر ڈال کر اپنی جیب سے ایک نازک سی رنگین پنسل نکالی اور پھر جلدی سے میرے ہاتھوں میں تھما دی اور پنسل کے اِس لمس میں نجانے کیا اعجاز تھا کہ میری پلکوں پر چمکتے ہوئے آنسو وہیں رُک گئے اور میرے ہونٹ ایک معصوم سی مسکراہٹ میں ڈوبتے چلے گئے اس وقت مجھے یوں لگا جیسے میں ایک بھیگی ہوئی چلمن میں سے کسی روشن اور تابناک دُنیا کا

نظارہ کر رہا ہوں۔

اس واقعے کے کئی برس بعد جب میں کالج میں تعلیم پاتے ہوئے ایک روز غالبؔ کے دیوان سے متعارف ہوا تو مجھے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے زمانے نے ایک اُلٹی زقند بھری ہے اور میں واپس گاؤں کے پرائمری سکول میں پہنچ گیا ہوں۔ غالبؔ مجھے ایک پریشان حال لڑکے کے پیکر میں نظر آیا لیکن اس طور کہ اس کی پلکیں آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھیں اور ہاتھوں نے رنگین پنسلیں تھام رکھی تھیں۔ غالبؔ سے قبل میں نے فانیؔ کا مطالعہ کیا تھا اور خود کو ایک ایسی سرزمین پر سرگرداں پایا تھا جہاں بادلوں کا سائبان تنا ہوا تھا اور یہ سائبان کسی مجبور کی آنکھ کی طرح ہولے ہولے ٹپکتا چلا جاتا تھا۔ پھر میں نے اکبرؔ کا مطالعہ کیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں کسی جلی جھلسی ہوئی کائنات میں دھکیل دیا گیا ہوں اور میرا سارا جسم سورج کی تیز شعاعوں سے پارہ پارہ ہو گیا ہے۔ لیکن غالبؔ کو ایک نظر دیکھتے ہی مجھے برسات کی وہ شام یاد آگئی جب موٹے موٹے بادلوں میں ایک شگاف سا پیدا ہو جاتا ہے اور اس شگاف میں سے سورج کی دزدیدہ نگاہیں ہر شے پر رنگوں کی جزالا انڈیل دیتی ہیں۔ آنسو اور تبسم ایک دوسرے سے ہم کنار ہو جاتے ہیں اور زندگی اپنے دکھوں اور مصیبتوں کے باوجود نہایت خوبصورت، لطیف اور قیمتی نظر آنے لگتی ہے۔ مجھے غالبؔ آنسوؤں میں مسکراتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ ایک ایسا انسان نظر آیا جسے بیک وقت غم اور خوشی کا عرفان حاصل ہو چکا ہو۔ بعض شاعر خوشی سے اس درجہ ناراض ہوتے ہیں کہ اُن کے ہاں غم کی گدلی روشنی کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہتا اور بعض اندر سے تو ٹوٹ پھوٹ رہے ہوتے ہیں لیکن دنیا کو دکھانے کے لئے اپنے ہونٹوں پر تبسم کی ایک جھالر سی آویزاں کر لیتے ہیں۔ غالبؔ مجھے ان دونوں قسم کے شعرا سے مختلف نظر آیا مجھے محسوس ہوا کہ غالبؔ کے ہاں جس طرح غم فطری ہے اس طرح تبسم بھی خود رو ہے مطلب یہ کہ غالبؔ ریاکار ہرگز نہیں۔ اُسے جب چبھن محسوس ہوتی ہے تو رو پڑتا ہے اور جب روتے روتے محسوس کرتا ہے کہ کسی نے رنگین پنسل اس کے ہاتھ میں تھما دی ہے تو بے اختیار ہنسنے لگتا ہے۔ مسکراہٹ کا یہ تابندہ لمحہ جب بوڑھا غم نئی نویلی مسرت سے ہم کنار ہوتا ہے۔ ایک ایسا نایاب لمحہ ہے جو غالبؔ کو عام شعرا کی سطح سے بہت اوپر اٹھا دیتا ہے۔ زبان کا

ایک شدید احساس اور پھر اس شدید احساس کی مضحکہ خیزی کا ایک گہرا شعور۔ عرفان کا یہ مقام غالب ہی کو حاصل ہوا ہے اور غالب کے ذریعے ہی مجھ ایسے لاکھوں انسانوں تک پہنچا ہے جو زندگی کو اس کی آلائشوں اور مصیبتوں کے باوجود ایک بیش بہا نعمت سمجھتے ہیں۔

میں نے اپنی زندگی میں غالب کے علاوہ اقبال کا بھی مطالعہ کیا ہے۔ اقبال ایک عظیم شاعر ہے اور اس کی شاعری نے لاکھوں اذہان کو منزل سے آشنا کیا ہے لیکن میں اقبال سے مرعوب تو ہوا خود کو اس کے حلقۂ احباب میں شامل کرنے پر کبھی مائل نہ کر سکا۔ ہر بار جب میں نے اقبال کو پڑھا تو مجھے یوں لگا جیسے ریلوے سٹیشن پر آواز کے آلے سے یہ اعلان نشر ہو رہا ہو کہ "مسافرو! جلدی کرو، بھاگو، دوڑو، ۱۵ اپ ٹرین کے چلنے میں صرف پانچ منٹ باقی رہ گئے ہیں" دوسری طرف غالب کا مطالعہ کرتے ہوئے میری چشمِ تصور نے دیکھا کہ اعلان کے شور اور انجن کے اضطراب سے بے نیاز کوئی شخص پلیٹ فارم کے ایک شکستہ بینچ پر اکڑوں بیٹھا کتاب کے مطالعہ میں غرق ہے۔ وہ اعلان کو سن کر ایک لحظہ کے لئے اپنی نظریں کتاب کے اوراق سے ہٹاتا ہے اور اپنے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے مسافر سے بڑے دھیمے اور ملائم لہجے میں پوچھتا ہے۔ "جناب! اس کے بعد دوسری گاڑی کتنے بجے جائے گی؟" اور جواب پا کر بڑے اطمینان سے دوبارہ کتاب کا مطالعہ کرنے لگتا ہے۔ غالب کو کسی بات کی بھی جلدی نہیں۔ اس کے سامنے زندگی اپنی تمام تر سلوٹوں کے ساتھ بچھی ہوئی ہے۔ ہر سلوٹ ایک خواہش ہے اور ہر خواہش پر اس کا دم نکلنے کو تیار ہے مگر ساتھ ہی اُسے اس بات کا احساس بھی ہے کہ یہ ساری سلوٹیں بے معنی ہیں۔ اور قدرت نے انسان کے ساتھ کوئی بہت بڑا مذاق کیا ہے! غالب کے سامنے نہ تو تعمیر کا کوئی منصوبہ ہے اور نہ اُسے کسی ارفع منزل ہی کی تلاش ہے۔ اُسے تو صرف اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے غرض ہے کہ آج کسی دوست کا خط آیا یا شام کس طرح بسر ہو گی یا پھر اپنی ذات، اپنی انفرادیت کو زمانے کی آندھی سے محفوظ رکھنے کے لئے آج کیا تدارک کرنا ہو گا؟ غالب شخصیت کے بوجھل لبادے سے گریزاں لیکن انفرادیت کے چار گرہ کپڑے کا والہ و شیدا ہے۔ وہ کسی دوسرے کے کنوئیں

سے اپنے باغ کو سیراب نہیں کرتا بلکہ اس کی آبیاری اپنی ذات کے مخفی چشموں سے کرتا ہے لیکن یہ ذات کیا ہے؟ ایک جہانِ ہوش ربا جو کسی تمثال دار آئینے کی طرح ہزار ٹکڑوں میں بٹ جانے کے باوجود آرزوؤں کے ایک شہر کی صورت میں قائم ہے۔ غالب جب اپنے اس آئینہ خانے سے مجھے آشنا کرتا ہے، تو آواز کو دگنا کر دینے والے آلے کا سہارا نہیں لیتا۔ بلکہ چپکے سے اپنا ہاتھ میرے شانے پر رکھ کر مجھے اس کی طرف متوجہ کر دیتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ میرے اندر چھپے ہوئے "دیدۂ عبرت نگاہ" کو متحرک ہی نہیں کرتا۔ ضرور کرتا ہے مگر ساتھ ہی اپنی ایک آنکھ میچ کر عبرت اور ندامت کے سارے تصور کو خندۂ استہزا میں بھی اڑا دیتا ہے۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ غالب ایک ایسا نقطہ ہے جہاں دو زمانے آکر ملتے ہیں۔ اور جہاں سے ایک تیسرا زمانہ اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ غالب وہ بھیگی ہوئی مسکراہٹ ہے، جو جلاد "ایسی مونچھوں اور بلکتے ہوئے آنسوؤں کے تصادم سے جنم لیتی ہے۔ اور پھر ایک نئے عہد کی علامت بن جاتی ہے۔ مجھے غالب کی یہ نٹ کھٹ معصوم اور بے داغ ادا پسند ہے کہ اس میں رفاقت کا احساس بھی ہے اور عرفان کے کوندے کی لپک بھی!

نانا جان

پو پھٹتے جب قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی تو درختوں میں گھرے ہوئے مکان کا دروازہ یکا یک کھلتا اور ایک دراز قد سائے کو باہر دھکیل کر بند ہو جاتا۔ یہ سایہ آہستہ آہستہ سر جھکائے مسجد سے الٹی سمت چلے جاتا۔ حتیٰ کہ رات کے بجھے ہوئے الاؤ کے قریب پہنچ کر چند لمحوں کے لئے رکتا زمین پر بیٹھ جاتا اور بجھے ہوئے الاؤ کو کرید کرید کر چند چنگاریاں جمع کرتا۔ انہیں چلم میں سجاتا اور اس کارروائی کے بعد آہستہ آہستہ چلتا واپس اپنے دروازے تک پہنچ جاتا۔ پھر دروازے کے پٹ کھلتے اور بند ہو جاتے اور یہ سایہ اپنی جھلنگا چارپائی پر دراز ہو کر عمرِ رفتہ کو آواز دینے لگتا۔

ہم سب اس سائے کو نانا جان کہا کرتے۔ ویسے وہ ہمارے نانا جان تھے نہیں۔ اگرچہ دُور کی رشتہ داری ضرور تھی۔ دراصل ان کی بزرگی، شفقت اور زندگی سے بے نیازی کے باعث ہم سب نے انہیں 'نانا جان' کا لقب دے رکھا تھا اور اب یہ لقب گھر کی چار دیواری کو پار کر کے قومی بلکہ بین الاقوامی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ کالو جلاہے سے لے کر حافظ لنگڑے تک اور سندر چمار سے لے کر خیرا تر کھان تک ہر شخص انہیں نانا جان ہی کہتا تھا اور تو اور گاؤں کی بڑی بوڑھیاں بھی انہیں اسی لقب سے پکارتی تھیں۔ البتہ گاؤں کے کتے قوتِ اظہار سے محروم ہونے کی وجہ سے صرف بھونکنے پر ہی اکتفا کر لیتے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اپنی زبان میں نانا جان ہی کہتے ہوں۔

جن دنوں کی یہ بات ہے نانا جان کی عمر کوئی اسّی برس کے لگ بھگ ہو گی — لمبا قد

سفید رنگ تیز آنکھیں اور آنکھوں کے نیچے اُبھرے ہوئے گوشت کے حلقے ہیں ان کے قد کو بجلی کے کھمبے سے تشبیہہ دیتا لیکن بجلی کا کھمبا بہت سیدھا ہوتا ہے اور نانا جان اوپر سے جاکر کچھ جھکے ہوئے تھے ہاں اگر کسی ایسے کھمبے کا تصور کیا جائے گا جو باد و باراں کے طوفان کے بعد اوپر سے خم کھا گیا ہو تو شاید تشبیہہ میں حقیقت کا رنگ جھلکنے لگے۔

نانا جان نے زندگی کی اسی بہاریں یا پت جھڑیں (جو چاہے کہہ لیجئے) دیکھی تھیں مگر اس زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں بسر ہوا۔ ہمارے گاؤں میں تو وہ زندگی کے آخری ایام میں تشریف لائے اور لگ بھگ دس برس تک یہیں مقیم رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے پھر کسی قصبے یا شہر کا منہ نہیں دیکھا۔

لاہور میں نانا جان کی زندگی کا رنگ کچھ نرالا ہی تھا اور اگرچہ گاؤں میں چلے آنے کے بعد بھی اس زندگی کے اثرات باقی رہے لیکن ان کا وہ انہماک بڑی حد تک کم ہو گیا جو لاہور کے طویل دورانِ قیام کا نتیجہ تھا۔ وہ بیس برس کے ہوں گے کہ ایک عزیز کی سفارش سے سرکاری عرضی نویس مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد اردو شاعری کے روائتی عاشق کی طرح ایک بار جو انہوں نے اس ملازمت سے عہدِ رفاقت باندھا تو پینتیس برس تک باندھے ہی رکھا۔ آخر ش ملازمت نے خود ہی ایک روز جواب دے دیا۔ ورنہ وہ تو شاید مرتے دم تک اس سے چمٹے رہتے۔

لاہور میں نانا جان کی زندگی ایک سیدھی لکیر تھی نہ ٹیڑھی۔ البتہ ان کے قدم ہر روز ایک مثلث ضرور بناتے تھے۔ اس مثلث کا ایک سرا تو اس تنگ و تاریک گھر میں تھا جہاں ان کی بیوی اور دو بچے رہتے تھے اور جہاں وہ پچیس روپے ماہوار داخل کرا دینے کے بعد یہ سمجھتے کہ انہوں نے دنیا و عقبےٰ، دونوں میں سرخروئی حاصل کر لی۔ مثلث کا دوسرا سرا عرضی نویسی کی اس مسند پر تھا جہاں وہ دس بجے صبح سے لے کر چار بجے شام تک 'ایک کل' کی طرح عرضیاں لکھتے اور انہیں لکھتے لکھتے ان کی انگلیوں پر کالی روشنائی کے بڑے بڑے دھبے پڑ جاتے۔ البتہ جب چار بجتے اور وہ اپنے کاغذات کو بڑی احتیاط سے ایک رومال میں باندھ کر رحمت پنواڑی کی دکان پر رکھ چکتے تو ان کا وہ سفر شروع ہوتا جو انہیں مثلث کے تیسرے کونے پر پہنچا دیتا اور یہی دراصل ان کی منزل تھی۔

مثلث کا یہ تیسرا سرا لاہور سے کوئی کوس بھر مشرق کی طرف "شبدر مالی" کے ایک پرانے قبرستان میں جاکر نمودار ہوتا۔ نانا جان ہر شام بڑے التزام سے وہاں پہنچتے۔ ٹوٹی پھوٹی اور ویران قبروں میں سے ہوتے ہوئے جھاڑیوں اور درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہو جاتے اور ایک بوسیدہ سی جھونپڑی کے قریب پہنچ کر رُک جاتے۔ سامنے کھجور کے بوریے پر ایک ننگ دھڑنگ فقیر لیٹا ہوتا جو ان کے پہنچتے ہی اُٹھ کر بیٹھ جاتا۔

"مرزا جی۔ آ گئے؟"

"ہاں بھئی۔ آ گئے!"

نانا جان جوتیاں اتار کر صف پر بیٹھ جاتے اور پگڑی اتار کر ایک طرف رکھ دیتے۔ فقیر ہولے ہولے اٹھتا۔ جھونپڑی میں سے دو پکی ہوئی سرخ اینٹیں، دو لکڑی کی غلیظ سی نلکیاں اور ایک تیل کا دیا لے آتا۔ دیا جلاکر زمین پر رکھ دیتا اور اس کے دائیں بائیں ایک ایک فٹ کے فاصلے سے دونوں اینٹیں جما دیتا۔ اب نانا جان اپنے کوٹ کی جیب میں سے چانڈو کی ایک پڑیا نکالتے اس میں سے نلکی کا منہ بھرتے اور اینٹ پر سر رکھ کر لیٹ جاتے پھر نلکی کو دیئے کی لو پر رکھ کر زور سے کش لگاتے۔۔۔

۔۔۔ ایک، دو، تین اور پھر نہ یہ زمین، زمین رہتی نہ آسمان آسمان۔ ایک دُھند سی چھا جاتی۔ خود فراموشی کے سلاسل دراز ہو جاتے اور زندگی و موت کے سب لاینحل عقدے دھوئیں کے گہرے مرغولوں میں تحلیل ہوتے ہوتے یکسر ناپید ہو جاتے۔

یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ ملازمت ملنے کے کچھ دنوں بعد انہوں نے یہ کارروائی شروع کی۔ اور دورانِ ملازمت کبھی ایک دن کا بھی ناغہ نہ کیا اور ملازمت ختم ہو جانے کے پندرہ برس بعد تک بھی اسی روش پر ڈٹے رہے حتیٰ کہ انہوں نے شہر چھوڑ دیا۔ اور گاؤں میں آ کر مقیم ہو گئے مگر اس تمام عرصے میں چانڈو اور قبرستان ان کی زندگی پر بُری طرح چھائے رہے۔ بیوی بددعائیں دیتی رہی۔ بچے سسکتے بلکتے لوٹ پوٹ کر بڑے ہوتے رہے۔ رشتہ دار طعنے دیتے رہے اور ماں آنسو بہاتی رہی لیکن نانا جان کا کاروانِ حیات برابر اپنی روش پر گامزن رہا۔ ملازمت ختم ہو جانے کے بعد مثلث کا ایک سرا تو خود بخود ختم ہو گیا۔ گھر پہ آنا جانا بھی انہوں نے بہت کم کر دیا اور

اب وہ آخری سرے پر دنیا و ما فیہا سے بے نیاز ہو کر بیٹھ گئے۔ماں کو ان سے بڑا پیار تھا جب یہ کئی کئی روز تک گھر نہ آتے تو بیچاری ہولے ہولے چلتی کسی نہ کسی طرح "شبد رمالی" کے قبرستان میں جا پہنچتی اور جھاڑیوں کے پیچھے رُک کر، زمین پر بے سدھ لیٹے ہوئے اس انسان کو ایک نظر دیکھ لیتی جو اس کی زندگی کا آخری سہارا، اس کی ٹمٹماتی ہوئی آرزوؤں کا مرکز اور اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔

لاہور میں چانڈو پینے کے علاوہ نانا جان کا ایک اور مشغلہ بھی تھا وہ یہ کہ ہر اتوار کو اپنے استاد غیاث الدین کی معیت میں میاں میر کے بعض سیم زدہ ٹکڑوں میں سانپ پکڑنے جایا کرتے تھے چنانچہ گاؤں میں اقامت پذیر ہونے کے بعد انہوں نے کئی بار مجھے اپنے سانپ پکڑنے کے بڑے بڑے معرکوں کا حال تفصیل سے بتایا اور ہر بار سانپوں کی کوئی ڈیڑھ درجن اقسام اور ان کی عجیب وغریب خصوصیات کا حال بیان کر کے میری معلومات میں بڑے قیمتی اضافے کئے۔ نانا جان اکثر اپنے استاد غیاث الدین کا بھی بڑی عقیدت اور خلوص سے تذکرہ کرتے۔ استاد غیاث الدین نہ صرف سانپ پکڑنے میں یکتا تھے۔ بلکہ وہ سانپ کھا بھی جایا کرتے تھے اور انہوں نے اس بلند مقام تک پہنچنے کے لیے ریاضت بھی بہت کی تھی۔ اس ریاضت کا آغاز بھنگ کے استعمال سے ہوا تھا اور چرس چانڈو، افیون اور کوکین سے ہوتے ہوئے سنکھیا پھانکنے تک جا پہنچا تھا۔ اپنے فن کی انتہائی منازل پر پہنچنے سے ذرا قبل وہ ایک وقت میں اس قدر سنکھیا کھا لیتے تھے جو کم از کم دو درجن انسانوں کو آن کی آن میں ختم کر سکتا تھا لیکن جب کچھ عرصے کے بعد سنکھیا بھی ان کی طلب پوری کرنے سے قاصر رہنے لگا تو انہوں نے سانپوں سے خود کو ڈسوانا شروع کر دیا۔ وہ سانپ کو گردن سے پکڑتے اور بڑے اطمینان سے اس کا منہ اپنی زبان تک لے جاتے پھر جب وہ زبان کو ڈس لیتا تو اُسے پرے پھینک دیتے اور خود فراموشی کے عالم میں پہنچ جاتے ہوتے ہوتے ———— نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک روز فرطِ جوش میں سانپ کی کھوپڑی تک چبا گئے۔ یہ ان کے فن کی آخری منزل تھی۔

نانا جان اپنے استاد غیاث الدین کی ان فنی بلندیوں تک تو نہیں پہنچ پائے البتہ انہوں نے سانپ پکڑنے کے عجیب وغریب ڈھنگ ضرور سیکھ لئے تھے۔ وہ اکثر سانپ پکڑتے اور

لکڑی کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی مدد سے اس کے دانت نکال دیتے اور پھر گھنٹوں اس کے ساتھ کھیلتے رہتے۔ بعد ازاں اپنے حقے کی نے سے میل کی ایک ننھی سی گولی نکال کر سانپ کے منہ میں ڈال دیتے اور سانپ تڑپ کر مر جاتا اور وہ مسکراتے ۔۔۔ ایک انتہائی بے رحم مسکراہٹ جو ان کے کردار کے بعض مخفی پہلوؤں پر روشنی کا ایک ہلکا سا پرتو ڈالتی۔

نانا جان کی عمر کوئی ستر برس کے قریب ہوگی کہ انہوں نے پہلی بار لاہور سے باہر قدم نکالا اور یہاں گاؤں میں آکر مقیم ہو گئے۔ ان کی والدہ لاہور ہی میں رہیں اور بیوی اپنے بیٹے کے ساتھ ایران چلی گئی۔ اب نانا جان بالکل آزاد تھے۔

گاؤں پہنچ کر نانا جان نے چانڈو پینے سے توبہ کر لی۔ توبہ نہ بھی کرتے تو گاؤں میں چانڈو کہاں سے لاتے۔ چنانچہ چانڈو کی جگہ بھنگ نے لے لی اور وہ اس کے دو پیالے صبح شام پی کر قناعت کی اقلیم کے تاجدار بن گئے۔ تخیلی دنیا کی بلندیوں سے اتر کر یوں پستیوں تک پہنچ جانا ان کے لئے سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔ لیکن مجبوری نے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دیں اور انہوں نے صبر شکر کر لیا۔ اب ان کا معمول یہ تھا کہ جب پو پھٹے قریبی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوتی تو وہ اٹھ بیٹھتے۔ چلم میں آگ رکھتے باہر جاتے۔ واپس آکر کچھ دیر حقے کے کش لگاتے۔ اتنے میں دارا بازیگر آجاتا۔ پھر کونڈی ڈنڈا نکلتا۔ بوٹی رگڑی جاتی اور نانا جان غٹا غٹ دو پیالے بھنگ کے پی جاتے۔ اس سے وہ یک گونہ بے خودی کی سی کیفیت تو طاری نہ ہو سکتی البتہ کچھ غنودگی سی ضرور ہو جاتی اور نانا جان اسی میں مست رہتے۔

تین برس گزر گئے۔

ایک روز میری معرفت نانا جان کے نام پہلا پوسٹ کارڈ آیا۔ کارڈ میں انہیں ان کی والدہ کی وفات سے مطلع کیا گیا تھا۔ میں بھاگ کر نانا جان کے کمرے میں جا پہنچا۔ نانا جان ۔۔۔ اپنی چارپائی پر بیٹھے ہوئے ہولے ہولے حقے کے کش لے رہے تھے۔ میں سمٹ کر پائنتی پر بیٹھ گیا۔

"نانا جان ایک بہت بُری خبر لایا ہوں"

انہوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا

"کیسی خبر برخوردار؟"

"نانا جان! آپ کی والدہ —" میں ایک لحظہ کے لئے رک گیا "آپ کی والدہ فوت ہوگئیں۔"

نانا جان کچھ دیر خاموشی سے بیٹھے حقے کے تیز تیز کش لیتے رہے اور پھر مسکرا کر میری طرف دیکھا۔

"برخوردار سب کو مر جانا ہے ۔ جاؤ آرام کرو!"......

نانا جان کی زندگی کے مہ و سال پھر اسی ڈگر پر چلنے لگے۔ کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ٹھہرے ہوئے تالاب میں کہیں سے ایک سنگریزہ آ گرا تھا لیکن بجز دو ایک ہلکی ہلکی لہروں کے کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ نانا جان پتھر ہو چکے تھے۔ ایک طویل تنہائی اور بے تعلقی نے شاید ان کے جذبات کے سارے سوتے خشک کر دیئے تھے اور اب وہ زندگی کے لق و دق صحرا میں ابوالہول کا سا ایک ایسا مجسمہ بن کر رہ گئے تھے، جس پر بیسیوں طوفانوں کا خروش گرج برس کر گزر جاتا ہے اور وہ اسی طرح ساکت و جامد رہتا ہے۔ پانچ برس اور گزر گئے!

نانا جان کی بیوی بھی فوت ہو گئیں۔ وہ اپنے وطن سے سینکڑوں میل دور تنہائی کی موت مر گئیں لیکن نانا جان پر اس خبر کا اثر اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ حقے کے دو ایک تیز تیز کش ہی لے لیتے۔

"سب کو مر جانا ہے برخوردار" اور بس!!

اب نانا جان بے نیازی اور تنہائی پسندی کے آخری مراحل تک جا پہنچے تھے لیکن اس بے تعلقی اور خلوت گزینی کے ساتھ ساتھ ان کی طبیعت کی سختی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کے سوئے ہوئے، غنودگی اور خود فراموشی میں ڈوبے ہوئے جسم کے اندر چھپا ہوا سنگ دل انسان زیادہ بے چین ہو رہا تھا۔ عام طور پر تو وہ یوں گم سم رہتے کہ اس انسان کا نام و نشان تک نہ ملتا لیکن جب کبھی ہوش میں ہوتے اور کوئی بھکاری یا کتا نظر آ جاتا تو یہ انسان مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا باہر نکل آتا اور وہ کھڑے کھڑے جلا دبن جاتے۔ آواز میں بلا کی کرختگی پیدا ہو جاتی اور ہونٹوں سے گالیوں کی جوالا مکھی پھوٹ بہتی۔ وہ اندرون لاہور کی تیار شدہ رنگین تشبیہوں اور استعاروں سے مزین ایسی لچھے دار گالیاں دیتے کہ خود بھکاری حیرت زدہ

ہوکر اس وقت تک ناناجان کا منہ دیکھتا رہتا جب تک وہ اُٹھ کر بھکاری کو گاؤں سے فوراً باہر نکل جانے کا حکم صادر نہ فرما دیتے لیکن وہ محض اسی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ بشیتر اوقات بھکاری کا پیچھا کرتے ہوئے اسے گاؤں سے باہر تک چھوڑنے جاتے۔ یہی سلوک وہ گاؤں کے تمام کتوں سے روا رکھتے اور شاید اسی لئے جو نہی کوئی کتا انہیں دیکھ پاتا فوراً بھونک کر ان کے رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر دیتا۔ مگر رحمتے ماچھن نے ایک روز ہونٹ اور ناک کی درمیانی جگہ پر انگشتِ شہادت رکھ کر اور یوں انتہائی حیرت کا اظہار کر کے مجھے بتایا کہ اس نے خود ان آنکھوں سے ناناجان کو موتی کے آگے روٹی کے ٹکڑے ڈالتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے بھی سخت تعجب کا اظہار کیا۔

آناً فاناً سارے گاؤں میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ کسی کو یقین ہی نہیں تھا کہ ناناجان جو کتوں کے ازلی دشمن تھے اس جنس کے ایک ذی روح پر کیونکر نظرِ عنایت کر سکتے تھے۔ مگر بات درست تھی اور آہستہ آہستہ سب کو یقین کرنا ہی پڑا۔

موتی دراصل گاؤں میں نووارد تھا۔ وہ رابعہ کا کتا تھا اور رابعہ خود گاؤں میں نووارد تھی۔ کوئی دو مہینے ہوئے وہ دلہن بنی پہلی بار ڈولی سے یہاں اتری تھی اور اس کے اترتے ہی اس کے حُسن کے چرچے عام ہو گئے تھے۔ یوں تو وہ کئی روز تک لمبا سا گھونگھٹ نکالے گاؤں میں پھرتی رہی تھی لیکن جب آخرکار گھونگھٹ اوپر اٹھتا اٹھتا محض دوپٹے کا پلو ہو کر رہ گیا تو ہم نے دیکھا کہ وہ اتنی خوبصورت نہیں تھی جتنی اس کی دھوم تھی۔ پھر بھی اس کی آنکھوں میں ایک سحر انگیز کیفیت ضرور تھی اور نہ جانے کہاں سے اسے ایسی بھرپور جوانی ملی تھی کہ دیکھنے والوں پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ موتی کو رابعہ نے خود ہی پالا تھا اور جب شادی کے بعد اسے سسرال آنا پڑا تو وہ موتی کو اپنے میکے کی نشانی سمجھ کر ساتھ لیتی آئی۔ ادھر موتی چونکہ گاؤں میں نووارد تھا اور گاؤں کے کتے مہمان نوازی کی مسلمہ روایات سے محض نابلد تھے اس لئے وہ ہر وقت رابعہ کے ساتھ ساتھ ہی رہتا۔ وہ کھانا پکا رہی ہوتی تو اطمینان سے سامنے بیٹھا اس کی حرکات و سکنات کو بغور دیکھتا رہتا۔ وہ تھک ہار کر کھاٹ پر جا پڑتی تو یہ کھاٹ کے نیچے لیٹ جاتا۔ وہ ایک بار اسے موتی کہہ کر پکارتی تو یہ سو بار دم ہلا کر ممنونیت کا اظہار کرتا اور جب

وہ باہر کھیتوں میں اپنے شوہر کے لئے کھانا لے کر جاتی تو یہ ایک وفادار غلام کی طرح اس کے پیچھے پیچھے کھیتوں تک جاتا اور پھر اس کے ساتھ ہی واپس گھر آجاتا۔

رابعہ اور موتی لازم وملزوم تھے اور اب کہ نانا جان نے موتی کے آگے روٹی کے چند ٹکڑے ڈال کر اپنی قدیم روایات کو یکایک توڑ دیا تھا۔ گاؤں بھر میں عجیب عجیب چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔ لوگ یہ مسئلہ حل کرنا چاہتے تھے لیکن کر نہیں پاتے تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ موتی پر نظرِ عنایت محض موتی پر نظرِ عنایت تھی یا رابعہ پر نظرِ عنایت کے لئے موتی کو آلۂ کار بنایا گیا تھا۔ وہ اسّی برس کے پیٹے میں تھے اس لئے یہ تو قریب قریب محال تھا کہ وہ ان سفید بالوں کے ساتھ عشق مشک کے بکھیڑوں میں پڑتے ممکن ہے موتی کی تنہائی، بے کسی اور وفاداری سے متاثر ہو گئے ہوں۔ آخر موتی بھی تو قریب قریب اسی ڈگر پر گامزن تھا جس پر وہ خود برسوں سے چل رہے تھے۔

لمحے دنوں میں، دن مہینوں میں تبدیل ہوتے چلے جا رہے تھے۔ رابعہ ہر روز دن چڑھے پاؤں سے ننگی سر پر چھاچھ کا برتن اور برتن پر ایک کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں اور ساگ لے کر باہر کھیتوں میں جاتی۔ اس کی راہ نانا جان کے مکان کے سامنے سے ہو کر گزرتی تھی شروع میں تو محض اتفاقاً انہوں نے موتی کو چند ٹکڑے ڈال دیئے تھے لیکن اب کچھ عرصے سے ان کی یہ عادت سی ہو گئی تھی کہ دن نکلتے ہی حقّہ لئے اپنے مکان کے باہر چبوترے پر آ بیٹھتے اور ہر راہرو کو نہایت بے نیازی سے گھورتے جاتے۔ راہرو بھی نانا جان کو دیکھ کر "السلام علیکم" کا نعرہ لگاتے اور نانا جان کبھی تو اسی جوش کے ساتھ وعلیکم السلام کہتے اور کبھی محض سر کی ہلکی سی جنبش سے سلام کی رسید سے مطلع کر دیتے۔ البتہ جب کچھ دیر بعد گاؤں کی عورتیں سروں پر چھاچھ کے برتن اور کھانے کا دوسرا سامان لئے گزرنے لگتیں تو وہ زیادہ انہماک سے ہر راہرو کی طرف متوجہ ہونے لگتے۔ اسی دوران رابعہ بھی گزرتی۔ نانا جان کے انہماک کا عالم تو وہی رہتا۔ البتہ حقّے کے کش نسبتاً تیز ہو جاتے۔ موتی رابعہ کے ساتھ ساتھ ہوتا مگر وہ ایک لحظہ کے لئے رابعہ کا ساتھ چھوڑ کر نانا جان کے پاؤں سونگھنے رک جاتا۔ نانا جان اپنا دستِ شفقت اس کے سر پر پھیرتے اور موتی دم ہلانے لگتا ادھر

رابعہ دُور تک چلی گئی ہوتی اور موتی کو اپنے ساتھ نہ پاکر وہیں سے آواز دیتی۔ "موتی ی ی" اور موتی یکایک نانا جان کو چھوڑ کر بڑی تیزی سے رابعہ کی طرف لپک جاتا اور نانا جان کا دستِ شفقت جو دوسری بار اُسے پیار کرنے کے لئے اوپر اٹھا تھا ہوا ہی میں معلق رہ جاتا اور وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھتے، حقے کا ایک طویل کش لیتے اور واپس اپنے کمرے میں پہنچ کر اندر سے کنڈی لگا لیتے۔

اور پھر موسم جو بدلا اور گاؤں کے ٹنڈ منڈ پیڑوں پر آہستہ آہستہ بہار کے شگوفے پھوٹنے لگے تو نانا جان بھی دفعتاً صدیوں کی گہری نیند سے بیدار ہوئے اور دامن سے گرد جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اب وہ محض گزرے ہوئے کاروان کو دیکھنے پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ جب رابعہ اور موتی ان کے سامنے گزرتے تو وہ خود بھی اٹھ کر کارواں میں شامل ہو جاتے۔ رابعہ سے کوئی بیس پچیس قدم پیچھے وہ آہستہ آہستہ چلتے جاتے۔ کبھی کبھی راستے میں موتی کو پچکار لیتے اور موتی مقناطیس کے دو ٹکڑوں کے مابین کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف کھنچتا رہتا۔ وہ جب رابعہ سے پیچھے رہ جاتا تو رابعہ تیز تیز قدم اٹھاتی اسے آواز دیتی — "موتی ی ی" اور وہ دوڑ کر رابعہ کے پاس پہنچ جاتا — رابعہ کے پاس پہنچ جاتا تو نانا جان اپنی رفتار کو تیز کر دیتے اور موتی کو ایک لمحے کے لئے پلٹ کر نانا جان کا ساتھ دینا پڑ جاتا۔ رابعہ کھیت میں پہنچ کر اپنے شوہر کے سامنے کھانا رکھ دیتی تو نانا جان دور کسی کھال کے کنارے بیٹھ جاتے اور پانی سے کھیلتے رہتے۔ پھر جب رابعہ کھانا کھلا چکنے کے بعد واپس لوٹتی تو وہ بھی اس کے پیچھے آہستہ آہستہ چلتے اپنے مکان تک پہنچ جاتے۔

رابعہ شروع شروع میں تو نانا جان کی اس عجیب وغریب حرکت سے گھبرائی۔ پھر شرمائی اور آخر مسکرانے لگی۔ نانا جان نے کبھی اس سے بات تک نہیں کی تھی۔ وہ تو موتی کو چاہتے تھے اور رابعہ کو ایک بوڑھے انسان کے جذبات کو مجروح کرنے کی بھلا کیا ضرورت تھی! وہ تو بس اس قدر جانتی تھی کہ نانا جان کو موتی سے پیار ہے۔ موتی کو بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ نانا جان کی نظرِ عنایت نے اسی کو منتخب کیا ہے، گاؤں والوں کا بھی اب قریب یہی خیال تھا اور نانا جان بھی بظاہر یہی جانتے تھے کہ ان کی عنایات کے دروازے موتی ہی پر

وا ہوئے ہیں۔

اور پھر ایک روز سارے گاؤں پر سناٹا چھا گیا۔ رابعہ یکایک مرگئی اور گاؤں کی اس نئی نویلی دلہن کی موت پر سب گاؤں والے آبدیدہ ہو گئے۔ وہ بیمار بھی نہیں ہوئی۔ آخری دن بھی وہ کھانا لئے کھیت میں گئی تھی اور تندرست ہی واپس لوٹی تھی۔ رات البتہ اُسے تکلیف ہوگئی۔ صبح کے قریب ایک مرا ہوا بچہ ہوا اور دن چڑھتے چڑھتے وہ شبنم کے ایک لرزتے ہوئے قطرے کی طرح فضائے بسیط کی پہنائیوں میں گم ہوگئی۔

پھر دن کے وقت بگولے اڑنے لگے۔ وحشت ناچنے لگی۔ رات کو کتوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ گاؤں کا سہاگ لٹ گیا تھا۔ رابعہ کے نوجوان شوہر نے دیواروں سے ٹکریں ماریں۔ رشتہ داروں نے صفِ ماتم بچھادی اور نالہ و شیون کی صداؤں نے گاؤں کی فضا کو کئی روز تک ملول و غم آگیں بنائے رکھا۔

اور پھر آہستہ آہستہ فضا اعتدال پر آگئی اور چند ہی ہفتوں میں پھر سے وہی چہل پہل نظر آنے لگی۔ ادھر ساون کی پہلی بارش بھی ہوگئی۔ سارے چہرے کھل اٹھے گویا ابرِ کرم نے دلِ کے داغ تک دھوڈالے۔

نانا جان پر رابعہ کی اچانک موت کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ حسبِ معمول صبح اٹھتے، چلم میں آگ کے کوئلے سجاتے۔ پھر بھنگ پیتے اور باہر چبوترے پر آکر بیٹھ جاتے اور گزرتے ہوئے کارواں کو انتہائی بے نیازی سے دیکھتے رہتے البتہ بھنگ کی مقدار میں کچھ اضافہ ضرور ہوا اور حقّے سے لگاؤ بھی کچھ بڑھ گیا۔

اب ساون کی موسلادھار بارشوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ سیاہ گھٹائیں برق و باراں کے ساز پر لہراتی چاروں طرف سے امنڈ آئیں اور دیکھتے دیکھتے خاک و افلاک پر چھاگئیں۔ آسمان ایک تنگ سا خول بن کر رہ گیا۔ اور اس خول کی دھواں دھار فضا سے لاکھوں کروڑوں قطرے تیز نوکیلے تیروں کی طرح زمین کے سینے میں پیوست ہونے لگے۔ کسان فکر مند ہو رہے تھے اگر بارشوں کا یہی انداز رہا تو سیلاب کا خطرہ تھا اور اگر سیلاب آگیا تو لہلہاتی ہوئی فصلوں کا کیا انجام ہوگا۔ انہیں سب کچھ معلوم تھا۔

اور پھر ایک روز گھرے ہوئے بادلوں میں ایک خاصا بڑا شگاف نمودار ہوا اور مشرق کے آسمان میں دھنک اپنی ساری دلفریبیوں کے ساتھ نمودار ہو گئی اور اسے دیکھ کر چھوٹوں بڑوں کے چہرے کھل اُٹھے .... آنکھوں میں مسرت ناچنے لگی۔ ہر شخص باہر نکل آیا۔ آنگنوں سے گاڑھا گاڑھا دھواں اُٹھنے لگا۔ پرندے فرطِ مسرت سے ہوا میں قلابازیاں لگانے لگے۔ زندگی کھلکھلا اٹھی۔ اب خطرہ ٹل گیا تھا۔

میں بھی کئی روز سے باہر نہیں نکل سکا تھا۔ چھڑی ہاتھ میں لئے دور کھیتوں میں نکل گیا حدِ نظر تک کپاس اور جوار کے دلفریب کھیت پھیلے ہوئے تھے اور برسے ہوئے پانی کے قطرے سورج کی روشنی میں تابناک موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔ ہر طرف ہریاول ہی ہریاول تھی۔ آسمان پر بڑے بڑے ابر پارے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے انتہائی تیزی سے افق کی جانب بھاگے چلے جا رہے تھے۔ کائنات میں یکایک ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔

انسانی مزاج پر ماحول اور فضا کا اثر بھی کس قدر قوی ہوتا ہے میں کئی ایک الجھنوں میں گرفتار ہونے کی وجہ سے ایک عرصے سے پریشان تھا لیکن اس روز کائنات نے نہا دھو کر اور سنگھار کر کے ایسا دلفریب منظر پیدا کر دیا کہ چند لمحوں کے لئے میری تمام الجھنیں ختم ہو گئیں اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں اتنا ہلکا اور سبک ہو گیا ہوں کہ فضائے لبسیط میں بڑی آسانی سے پرواز کر سکتا ہوں۔

میں کوئی گھنٹہ بھر گھومنے کے بعد واپس لوٹا۔ گاؤں کے قریب ہی درختوں کا ایک جھنڈ ہے اور گاؤں کی طرف آتی ہوئی پگڈنڈی اس جھنڈ کے قریب سے ہو کر گذرتی ہے میں چھڑی کو ہوا میں گھماتا اور ہولے ہولے سیٹی بجاتا اس جھنڈ کے قریب سے گذرا تو رُک گیا۔ دبی دبی سسکیوں کی آواز آ رہی تھی۔ ایسے دلفریب موسم میں یہ کون خستہ جان تھا جو اس دردانگیز سوز سے رو رہا تھا؟ میں ہولے ہولے چلتا درختوں کے جھنڈ میں داخل ہو گیا اور ایک خاردار جھاڑی کے قریب پہنچتے پہنچتے یکایک ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرا دل اپنے ہاتھ میں لے کر مسل دیا ہے۔ سامنے نانا جان زمین پر بیٹھے

تھے. موتی کو انہوں نے بڑے زور سے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا رکھا تھا اور ان کے آنسو تھے کہ ساون کی بارش کی طرح ان کے گالوں پر سے پھسلتے ہوئے موتی کے ملائم بالوں میں جذب ہو رہے تھے۔

ٹوٹا ہُوا تارا

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ادب کے آسمان پر ایک شہابِ ثاقب نمودار ہوا تھا اور اس شہابِ ثاقب کے تعاقب میں ایک شعاعِ نور دوڑتی ہوئی چلی گئی تھی اور اس شعاعِ نور نے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی فضا کو نور سے لبریز کر دیا تھا۔ لیکن وہ لوگ جو اس کا گہری نظر سے جائزہ لیتے رہے اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ وہ محض ایک ٹوٹا ہوا تارا تھا۔ ایک ایسا ستارہ جو ابدی تاریکیوں سے ابھرا، دم بھر چمکا۔ اور ٹوٹ کر ابدی تاریکیوں میں پھر سے گم ہو گیا ــــ لیکن اپنے پیچھے ایک ایسا غبارِ نور چھوڑ گیا جس پر تاریکی کبھی غلبہ نہیں پا سکے گی۔

شمس آغا کے ابھرنے سے ہمارے ادب میں کون سا نیا معیار استوار ہوا یا اس کے روپوش ہو جانے سے ہمارے ادب کو کتنا صدمہ پہنچا۔ یہ باتیں میں زیرِ بحث نہیں لاؤں گا کیونکہ یہ کام آپ کا ہے اور آپ ہی اس کا بہتر جائزہ لے سکتے ہیں لیکن میں شمس کی ادبی کاوشوں کے پسِ پشت اس سسکتی ہوئی روح اور تڑپتی ہوئی شخصیت کو ضرور بے نقاب کروں گا۔ جو ان تخلیقات کا محرک ثابت ہوئی تھی اور جس نے آخرکار ایک حساس اور خوددار نوجوان کو ایسے قعرِ فنا میں کود جانے پر مجبور کر دیا تھا جس سے وہ پھر کبھی باہر نہیں آ سکے گا۔

میں شمس کو اس روز سے جانتا ہوں، جب وہ سنہری بالوں والا ایک شرمیلا سا لڑکا تھا اور سال بھر میں صرف ایک بار ہمارے ہاں آیا کرتا تھا۔ اور یہ آنا بھی کیا ہوتا، ایک شرمیلا سا اجنبی لڑکا جو ہم سے کھل کر بات بھی نہ کرتا بلکہ دور کھڑا دھیرے دھیرے مسکراتا رہتا اور پھر یہ چند روز ختم ہو جاتے اور وہ واپس چلا جاتا اور اپنی والدہ کو دس دس صفحوں کے لمبے خط لکھتا رہتا

یہ وہ دن تھے جب وہ اپنے تعلیمی مدارج بڑی سرعت کے ساتھ طے کر رہا تھا۔ چنانچہ ہم آئے دن سنتے کہ وہ فلاں کلاس میں اوّل رہا۔ اس نے وہ تمغہ جیت لیا۔ اس نے یوں بے جھجک ہوکر تقریر کر ڈالی اور سچ تو یہ ہے کہ جب ہم یہ باتیں سنتے تو قدرتی طور پر ایک احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے۔ چنانچہ ہر اگلی بار جب وہ آتا، ہم سب لڑکے اس کے ان کارناموں کے باعث اس سے کافی کھچے کھچے رہتے۔

اس سنہری اور خاموش لڑکپن کے بعد ایک ہنگامہ پرور شباب آیا۔ اور وہ "وسویس" جو سالہا سال تک ایک ابدی چپ سادھے کھڑا رہا تھا۔ یکایک ایک اندرونی تموّج اور ایک فطری خلفشار کے سبب پھوٹ کر بہہ نکلا۔ چنانچہ ادھر اس نے جوانی میں قدم رکھا۔ ادھر بیک وقت دو ایسے واقعات رُونما ہوئے کہ وہ خوش باش جگھٹوں اور بے فکری کے قہقہوں سے کنارہ کش ہوکر ایک ایسی گہری اور پُراسرار دنیا کی طرف پھر گیا جس سے وہ آخری وقت تک نجات نہ پا سکا۔ یہ دو واقعات تھے ـــ محبت اور اس کے دادا جان کی موت دادا جان کی موت ایک ایسا حادثہ تھا کہ اس کے بعد اس کی اقتصادی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی اور اسے مجبوراً کالج کی تعلیم کو الوداع کہنا پڑا۔ تعلیم کا سلسلہ قطع کر کے اپنے خوابوں کا گلا گھونٹ دینا ہی اس ذہین اور حساس نوجوان کو کچل دینے کے لئے کافی تھا لیکن مصیبت یہ ہوئی کہ اس کے ساتھ ساتھ اُسے ایک کلبلاتی ہوئی اور پریشان حال زندگی کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی شاید وہ اس طوفان کے بے رحم تھپیڑوں سے خود کو محفوظ کر لیتا اور شاید اپنے لئے کوئی مستقل راہ بھی تلاش کر لیتا۔ لیکن ان ہی دنوں وہ محبت کی خلش ناک اذیت میں مبتلا ہو گیا۔ گریز اور جھکاؤ کے احساسات بیک وقت معرضِ وجود میں آئے۔ ایک طرف دنیا میں کچھ بن جانے کی وہ شدید آرزو تھی جسے اس نے بچپن سے پال پوس کر بڑا کیا تھا اور جو اب اس کے ذہن کا ایک ضروری جزو بن چکی تھی اور دوسری طرف اپنی محبوبہ کو حاصل کر کے تمام زندگی اپنی اقتصادی الجھنوں کو سلجھانے کی ایک مسلسل کاوش کا سوال تھا اور ظاہر ہے کہ وہ ایسی دو کشتیوں میں سوار ہو گیا تھا جو متوازی چلنے کی بجائے متضاد سمتیں اختیار کر رہی تھیں۔ ویسے ردِّ عمل کے طور پر اس کے خیالات باہر کی اشیاء سے ہٹ کر اس کی اپنی ذات کی طرف بڑی تیزی سے منعطف

ہو رہے تھے۔ اور اس کی زندگی ایک پُراسرار سوال، ایک مسلسل خیال اور ایک بیکراں سوچ میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔

اُن ہی دِنوں وہ ایک لمبے عرصے کے بعد ایک روز مجھے لاہور میں مل گیا۔ میں نے بڑی مشکل سے اُسے پہچانا۔ وہ کس قدر بدل چکا تھا مگر اس بدلے ہوئے چہرے کے پسِ پشت ایک ذہنی انقلاب بھی آیا تھا۔ ہم لارنس کے ایک خاموش سے گوشے میں ایک بنچ پر بیٹھے تھے اور فضا میں نئی کھلی ہوئی کلیوں کی مہک رچی ہوئی تھی۔ کچھ اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ کہنے لگا" لیکن میں زندگی کا مقصد تعمیر کرنے سے ہچکچاتا ہوں۔ مقصد کی عمارت بنیادی طور پر ریت کی دیوار ہے — کیوں کہ زندگی فانی، مقاصد فانی، کردار فانی عمل فانی اور نتائج فانی — ہر شے فانی ہے۔ میں گردشِ غلطی میں محض ایک نقطے۔ مقصد سے کیوں چمٹ جاؤں۔ میں چمٹنا نہیں چاہتا۔ بہنا چاہتا ہوں۔ گھومنا چاہتا ہوں۔" کچھ دیر ٹھہر کر کہنے لگا۔ مسرت بھی کوئی علیحدہ شے نہیں۔ انہی حادثات کی دوسری صورت ہے۔ میں راحت و مسرت، اطمینان و سکون سے اُکتا سکتا ہوں۔" ظاہر ہے کہ یہ نوجوان ایک لمبی اور گہری سوچ بچار کا عادی ہو چکا تھا اور اس کے خیالات اس تاریک قنوطیت کی طرف برق رفتاری سے بہے چلے جا رہے تھے جو بعد ازاں اس کے سراپا پر مکمل طور سے مسلط ہو جاتا تھا۔

مگر اس سے قبل کہ یہ قنوطیت اس پر پوری طرح مسلط ہو جاتی، اس نے اس سے دامن بچانے کی ایک پُرزور کوشش کی۔ اور اسی کوشش میں اس کی زندگی نے دو پلٹے کھائے اور اس کا ذہن دو زبردست انقلابوں کی آماجگاہ بنا۔ پہلی کوشش اپنی اقتصادی حالت کو سنوارنے کے لئے تھی۔ اچھی ملازمت حاصل کرنے کے لئے سفارش ضروری تھی اور تجارت کے لئے سرمایہ درکار تھا اور یہاں نہ سرمایہ تھا اور نہ سفارش۔ پھر بھی اس نے تجارت کے لئے کچھ ہاتھ پاؤں ضرور مارے۔ اپنا سامان۔ کتابیں اور دوسری چیزیں اونے پونے بیچ ڈالیں۔ دوست احباب سے کچھ قرض لیا اور اس حقیر سی رقم سے تجارت کرنے کی کوشش کی لیکن کامیابی کی دیوی نے دور ہی سے آنکھیں چُرا لیں اور تقدیر منہ پھیر کر کھڑی ہو گئی اور یہ نوجوان ڈلہوزی کی بلندیوں پر کئی روز گذارتے اور وہاں کے قدرتی مناظر، چمبے کی دوشیزاؤں اور پہاڑی علاقے کی غربت پر کئی ایک مضامین لکھ کر واپس میدان میں اُتر آیا — اس

کے بعد اس نے تجارت کا پھر کبھی نام نہیں لیا۔ اب وہ ملازمت کے لئے سرگرداں نظر آنے لگا۔ پسند نا پسند کا سوال ہی نہیں تھا۔ یہاں تو زندہ رہنے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ کسی عزیز رشتہ دار کو مدد کے لئے وہ پکار نہیں سکتا تھا۔ روپیہ ختم ہوتا جارہا تھا اور لیلائے ملازمت افق میں گم ہوتی نظر آرہی تھی — اور پھر اُسے واقعی ملازمت مِل گئی۔ ملازمت کیا ملی۔ اس کی آرزوؤں، امیدوں اور خوابوں کا خون ہوگیا۔ اس کی خودداری پر یہ پہلی کاری ضرب پڑی تھی۔ لائف پر ایکسچینج EXCHANGE میں تیس روپیہ ماہوار کی ملازمت اُسے جسمانی طور پر شاید زندہ رکھ سکتی۔ لیکن ذہنی آسودگی کا تو تصور بھی یہاں ناممکن تھا اکثر یوں ہوتا کہ مہینے کے پہلے بیس روز بُرے بھلے کسی نہ کسی طرح کٹ جاتے اور آخر دس روز صرف ایک وقت کے کھانے پر اکتفا کیا جاتا۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ بسا اوقات ایک آدھ فاقہ بھی آجاتا تھا۔ لیکن اس خارجی زندگی کے پلٹے کے ساتھ ساتھ وہ ایک ذہنی انقلاب سے بھی دوچار ہوا اب اُس نے اپنی ذات کے متعلق خواب دیکھنے ترک کر دیئے تھے۔ مستقبل میں اپنے لئے آسائش و مسرت حاصل کرنے اور اقتصادی طور پر فارغ البال ہوجانے کا اب اُسے کبھی خیال نہ آتا بلکہ اب اس کی نظریں ان کروڑوں افراد پر تھیں جو بلک رہے تھے، سسک رہے تھے اور زندگی کی ورڑھیں پسینہ پسینہ ہوتے جارہے تھے۔ ان ہی دنوں اس پر اشتراکیت نے اثر ڈالا۔ اور زندگی کے متعلق اس کے زاویۂ نگاہ میں ایک انقلابی تبدیلی نے قدم جمانے شروع کر دیئے۔

شمس کی زندگی کے دوسرے زبردست پلٹے اور اس کے ساتھ ایک نئے ذہنی انقلاب کا تذکرہ کرنے سے قبل میں اس پُراسرار شام کا ذکر کردینا مناسب سمجھتا ہوں جس نے اُسے آئندہ چندسال تک زندہ رکھا اور اُسے اس قابل بنا دیا کہ وہ قنوطیت کی تاریک موجوں میں گھرا ہوا بھی اپنے آلام و مصائب کو خندۂ استہزاء میں اڑا سکتا۔ یہ شام شاید اس کی زندگی کی سب سے پُرمسرت شام تھی۔ وہ ہمارے ہاں گاؤں میں چند دنوں کی رخصت پر آیا ہوا تھا ان ہی دنوں میں بھی کالج کی تعلیم سے فارغ ہوکر گاؤں واپس آگیا تھا اور ہم نے اس فراغت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تصوّف اور ویدانت کا مطالعہ شروع کردیا تھا۔ میرے والد کی زندگی

بھی اسی دشت کی سیاحی میں گزری تھی۔ اس لئے بحث و تمحیص کی لمبی لمبی صحبتیں بھی میسر آنے لگیں اور پھر وہ شام آگئی ـــ میں چائے پی رہا تھا کہ وہ نہر کی جانب سے بھاگا بھاگا میرے پاس آیا اور مجھے اپنے ساتھ چلنے پر مجبور کرنے لگا۔ میں نے دیکھا اس کا چہرہ فرطِ مسرت سے سُرخ ہو رہا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مسرت کی کسی شدید ترین لہر کو دبانے کی ناکام کوشش میں ہے۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ راستہ بھر وہ خاموش رہا لیکن جب ہم گاؤں کی قریبی نہر پر پہنچ گئے اور سبزے پر جا کر بیٹھ گئے تو اس نے بے اختیار ہنسنا شروع کر دیا کئی منٹ وہ مسلسل ہنستا چلا گیا اور میں حیرت زدہ ہو کر کبھی اس کے چہرے کی طرف دیکھتا اور کبھی اس کی ہنسی میں شریک ہو جاتا۔ بارے یہ طوفان ختم ہوا تو اُس نے مجھے بتایا کہ آج اس نے کائنات کو ایک ایسے نئے زاویے سے دیکھا ہے کہ اس کے تمام تر مصائب کا بوجھ اس کے شانوں سے نیچے گر گیا ہے۔ وہ کہنے لگا ..." اب سے چند لمحات پہلے میں یہاں اسی سبزے پر بیٹھا تھا۔ چاروں طرف مکمل سکوت تھا۔ کائنات نے گویا دم سادھ لیا تھا۔ نہر کے اس کنارے پر سے ایک فاختہ اڑی اور ان درختوں کے اوپر سے اِدھر کو گھوم گئی اور مجھے یکایک محسوس ہوا کہ کائنات کی ہر شے، درخت، پانی، زمین اور آسمان گھومنے لگے ہیں۔ گھومنے لگے ہیں اور میں پھیل رہا ہوں تم شاید یقین نہ کرو لیکن میں نے خود کو ایک نقطہ سے اُبھر کر چاروں اطراف میں اس برق رفتاری سے پھیلتے ہوئے دیکھا ہے کہ میں چند ہی لمحوں میں تمام آکاش سے زیادہ وسیع ہو گیا تھا۔ کوئی شے باقی نہیں رہی تھی۔ نہ زمین تھی ـ نہ آسمان، نہ چرند نہ پرند، نہ درخت، نہ کھیت، صرف میں باقی رہ گیا تھا۔ خیالات کی پرواز تک رُک گئی تھی۔ صرف اپنے پھیلاؤ اور اپنی لامحدود وسعت کا ایک بے پایاں احساس باقی رہ گیا تھا۔ یہ کیفیت نہ جانے کتنا عرصہ رہی البتہ جب میں واپس اس پیکرِ خاکی میں آیا تو مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرا بوجھ بے حد ہلکا ہو چکا ہے اور میں مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک برق رفتاری سے پرواز کر سکتا ہوں۔ اس احساس کے ساتھ ساتھ مجھے اس لازوال مسرت کا احساس ہوا جسے میں ہزار کوشش پر بھی ضبط نہیں کر سکا۔" تو یہ تھی وہ شام اور یہ تھا وہ نیا احساس! میں مانتا ہوں کہ یہ کیفیت اس کی پُر آلام زندگی کا ایک زبردست ردِ عمل تھی، لیکن یہ حقیقت

ہے کہ یہی ردِ عمل آگے چل کر شمس کے بہت کام آیا۔ اور اس نے اس کی زندگی، اس کے افکار، احساسات اور نتیجۃً اس کی تخلیقات پر بڑے بڑے اور واضح نقوش ثبت کئے۔

اس واقعہ کے بعد کئی ایک ماہ تک اُس کی زندگی کے صبح وشام اپنی پرانی ڈگر پر چلتے رہے اور پھر وہ دوسرا پلٹا آیا جس کی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں۔ اپنے ایک مختصر سے خط میں اس نے مجھے اطلاع دی کہ نوکری چھوٹ گئی ہے لیکن وہ کسی اور ملازمت کے لئے تگ ودو کر رہا ہے۔ اس کے بعد کافی عرصہ تک خاموشی چھائی رہی۔ مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس نے یہ عرصہ کس طرح بسر کیا البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس صحرا نوردی کے بعد جب وہ دوبارہ مجھے گاؤں میں ملا تو وہ اس شمس سے قطعاً مختلف تھا جسے میں نے پچھلی بار رخصت کیا تھا۔ اب وہ بظاہر نہایت خاموش اور پُر سکون نظر آ رہا تھا لیکن اس کے ہونٹوں کا زہریلا تبسم اور اس کی آنکھوں کی پُر اسرار چمک صاف طور پر اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ اِن شکستہ و ریختہ دیواروں کے پیچھے ایک خوفناک لاوا کھول رہا تھا اور جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میرا خیال صحیح تھا شمس اب وہ پہلا سا الصافات پسند سر تسلیم خم کر دینے والا شمس نہ تھا۔ مسلسل غربت، ذلت اور آلام و مصائب آخر رنگ لائے تھے۔ اب وہ ایک پکا اشتراکی ہی نہیں تھا جسے اپنا نہیں بلکہ لاکھوں کروڑوں سسکتے ہوئے لوگوں کا درد ہو بلکہ اب وہ دہشت پسند بن جانے کے لئے بھی تیار ہو رہا تھا۔ مسکرا کر کہنے لگا۔ "دنیا نے مجھے قبول نے سے انکار کر دیا ہے۔ تمام ممکن دروازے میرے لئے بند ہیں — اور اگر میں بھی دنیا کے سامنے جھکنے سے انکار کر دوں تو دنیا میرا کیا بگاڑ لے گی؛ اگر میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دوں اور دنیا کی اقدار کو توڑ پھوڑ کر پاؤں تلے کچل ڈالوں تو زیادہ سے زیادہ دنیا یہی کرے گی کہ مجھے پھانسی کے تختے پر لٹکا دے — بس؛ اس سے فرق ہی کیا پڑے گا۔ میرے لئے زندگی اور موت ایک ہی بات ہے —" اور جب اس نے اپنے خیالات کو تفصیل سے بیان کیا اور اپنے دہشت پسندی کے پروگرام کو میرے سامنے کھول کر رکھا تو میں حیرت زدہ ہو کر رہ گیا۔ میرے سامنے یہ نوجوان تھا جس کی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں تھی مگر جس نے دنیا کو اتنے قریب سے دیکھ لیا تھا کہ اب اُسے اس کی ذرا برابر پرواہ نہیں تھی اور وہ اس کی اقدار کو کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اس کے ارادے اب اس قدر پختہ اور اٹل ہو چکے تھے کہ کسی قسم کی بحث یا منطق بھی اس کے خیالات کو متزلزل نہ کر سکتی تھی اور مجھے تو یقین ہے کہ اس وقت اس کا عزم اس قدر قوی تھا کہ اگر قارون کا خزانہ بھی اُسے پیش کر دیا جاتا تو وہ اسے ٹھکرا کر چلا جاتا۔

اور دوسرے روز وہ گاؤں چھوڑ کر چلا گیا۔ جاتی بار وہ زیرِ لب مسکرا رہا تھا اور بس! — اس کے پورے ایک ماہ بعد وہ مجھے نزدیکی شہر کے ریلوے سٹیشن پر مل گیا۔ اب اس کے کپڑے میلے تھے۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی آنکھیں اندر کو دھنس چکی تھیں، اور چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ میں نے جب اُسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا تو خلافِ معمول اس نے ایک بار بھی انکار نہیں کیا بلکہ چپ چاپ میرے ساتھ ہو لیا۔ گھر پہنچ کر اس نے اتنا کھانا کھایا جو شاید تین آدمی مل کر نہ کھا سکیں۔ میں نے غور سے دیکھا لیکن اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی نہیں تھی۔ وہ طنزیہ تبسم بھی کہیں کھو گیا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا عزم غرور اور جوش سب کچھ فنا ہو چکا ہے اور اب وہ ایک کم شکستہ انسان کی طرح سہارا لینے کا آرزو مند ہے۔ شام کے قریب میں اُسے سیر کے لئے لے گیا اور جب اس نے انتہائی سنجیدگی کے ساتھ پچھلے ایک ماہ کے واقعات مجھے سنانے شروع کئے تو میں حیران رہ گیا۔ وہ کہہ رہا تھا — لیکن میں بزدل تھا۔ مجھے کبھی خیال بھی نہیں تھا کہ میں اتنا ڈرپوک ثابت ہوں گا۔ تم جانتے ہی ہو۔ میں امیر انسانوں کو قتل کرنے اور ان کی دولت چھین کر غریبوں ناداروں میں تقسیم کرنے نکلا تھا۔ میرے ہینڈ بیگ میں ایک فٹ لمبا چھرا تھا، کچھ پٹیاں اور ٹنکچر آیوڈین کی ایک بوتل میرا پہلا قدم یہ تھا کہ کسی ایسے آدمی کو قتل کیا جائے جس کے پاس ریوالور ہو۔ فرسٹ یا سکینڈ کلاس کا کوئی ایسا مسافر جو اکیلا سفر کر رہا ہو، اور جس کے پاس میری مطلوبہ چیز ہو، میرا پہلا نشانہ تھا اس کے بعد مجھے چلتی گاڑی سے کود جانا تھا اور چونکہ چوٹ لگنا یقینی امر تھا۔ لہٰذا میں نے ٹنکچر آیوڈین اور پٹیاں ساتھ رکھ لی تھیں۔ ریوالور میرے ہاتھ آ جاتا تو میں آسانی سے ان تمام لوگوں سے انتقام لے سکتا تھا جنہوں نے ۔۔ خیر لیکن ناکامی میری قسمت میں لکھی تھی لائل پور سٹیشن پر ایک شخص اکیلا سکینڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہوا۔ گاڑی چلتے ہی میں اُسے آسانی سے قتل کر سکتا تھا لیکن جب میں نے اسے ساتھ کے کمپارٹمنٹ میں اپنی نوجوان اور خوبصورت بیوی سے

باتیں کرتے دیکھا تو میرا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ ایک اور بار میرے ساتھ ایک نوجوان سفر کر رہا تھا لیکن اس سے قبل کہ میرا چھرا اس کی چھاتی میں اُتر جاتا مجھے اس کی جوانی پر رحم آگیا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں کسی بوڑھے کو قتل کروں گا۔ نوجوان کو نہیں۔ ایک موقع بھی ہاتھ آیا لیکن عین جس وقت گاڑی نے چلنا شروع کیا ایک اور مسافر بھاگ کر اسی ڈبے میں سوار ہو گیا اور میں اپنے پروگرام کو عملی جامہ نہ پہنا سکا — اب دن گزرتے چلے جا رہے تھے۔ میرے پاس روپے ختم ہو رہے تھے اور منزل ابھی بہت دور تھی اور آخرش روپے بالکل ختم ہو گئے۔ اب میں بے ٹکٹ سفر کر رہا تھا۔ بھوکا پیاسا، کوئی منزل نہیں۔ کوئی راستہ نہیں۔ کہاں جاؤں کہاں نہ جاؤں۔ بنگال میں جب قحط پڑا تو میں سوچا کرتا تاکہ لوگ کیوں اشیائے خوردنی کی دکانوں کو لوٹ نہیں لیتے مگر اب مجھے احساس ہوا کہ مسلسل فاقے سے تو انسان اس قدر پست ہو جاتا ہے کہ وہ اس قسم کی بات سوچ بھی نہیں سکتا۔ پچھلے پہر کے قریب ریل جالندھر سٹیشن پر رکی۔ میں یوں ہی بے مطلب اُتر آیا۔ کچھ دیر پلیٹ فارم پر پھرتا رہا پھر شہر کی طرف چل کھڑا ہوا۔ اب میں گلیوں اور بازاروں میں آوارہ و پریشان حال پھر رہا تھا۔ کسی سے کچھ کھانے کو مانگنا چاہتا تھا لیکن مانگنے کی عادت نہیں تھی اور ہمت جواب دے رہی تھی۔ شام پڑ گئی۔ دھندلکے چھا گئے۔ میرے قدم لڑکھڑانے لگے۔ ایک گلی میں مڑا تو میں نے دیکھا سامنے ایک شکستہ سی دیوار کے عین اوپر ایک بہت بڑا گول سا چاند ابھر آیا تھا۔ میں نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ جیسے چاند مسکرا کر مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ "کیوں یار! روٹی ملی؟" — گلی میں کچھ دور ایک آدمی کھڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس سے کہا "مجھے سخت بھوک لگی ہے" وہ شخص ایک معمولی فوٹوگرافر تھا لیکن جس خلوص اور ہمدردی کا اس شخص نے مظاہرہ کیا ہے، میں اسے کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ تین دن میں اس کے پاس رہا۔ اور وہ مجھے ملازمت دلانے کی کوشش کرتا رہا۔ تیسرے روز میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ پچھلے دو روز سے میں بے ٹکٹ سفر کر رہا تھا کہ تم نے مجھے پکڑ لیا" اس واقعے کو بیتے آج ایک زمانہ ہو چکا ہے لیکن میں آج بھی چشمِ تصور میں اُسے ایک پتھر پر بیٹھے اور یہ واقعات سناتے ہوئے بخوبی دیکھ سکتا ہوں۔

ویسے بھی شمس کی زندگی کا یہ ایک بہت بڑا موڑ تھا اس کے بعد اس کی مختصر سی زندگی کا دوسرا

اور پہلے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ دور شروع ہوا۔ پہلے دور میں وہ جسمانی طور پر زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ اس دور میں جسم کے لئے سہولتیں تو اُسے کافی مِل گیئں البتہ روح بدستور پیاسی رہی اور واقعات۔ جو اس پر بیتنے کی قسم کھا چکے تھے، نئے سے نئے رُوپ بدل کر اس پر وارد ہوتے رہے اُسے نت نئی الجھنوں سے نبرد آزما کرتے رہے حتیٰ کہ اس کے احساس کا پیمانہ نازک تر ہو گیا۔ طبیعت میں بے نیازی آگئی۔ ایک عجیب قسم کی پختگی نے معصومیت پر چھا جانے کا عمل شروع کر دیا۔ اب وہ میرے پاس گاؤں میں قیام پذیر ہونے اور کاشتکاری اور باغبانی میں دلچسپی لینے پر رضامند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ دو برس میرے پاس رہا۔ اسی عرصے میں اس نے اپنے تمام ہنگامہ خیز افسانے لکھے اور مجھے اس کے احساسات کے ساتھ ساتھ چلنے، اس کے ساتھ طویل ترین تبادلہ خیالات کرنے اور اس کے ذہنی مدوجزر کا قریب سے مطالعہ کرنے کے کئی مواقع میسر آئے۔

میں نے شروع میں ہی یہ عرض کیا تھا کہ جوانی میں قدم رکھتے ہی شمس کی زندگی میں بیک وقت دو واقعات رُونما ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک واقعہ تھا اس کے دادا جان کی موت۔۔۔! اور دوسرا محبت۔ دادا جان کی موت اس کی اقتصادی الجھنوں کا پیش خیمہ تھی۔۔۔ وہ الجھنیں جو اس کی زندگی کے پہلے دور پر کثیف و غلیظ بادلوں کی طرح چھائی رہیں لیکن جو اس دور کے خاتمے پر یا تو چپ چاپ منہ بسورے رخصت ہو گیئں۔ یا اگر کبھی ظاہر بھی ہوئیں تو وہ ان سے بے نیاز ہی رہا لیکن محبت کا جذبہ اس پہلے دور میں آہستہ آہستہ پروان چڑھتا رہا اور اس دور کے خاتمے پر ایک نئی شدت اور ایک ایسے نئے روپ میں ظاہر ہوا کہ اُس نے بقیہ زندگی اسی کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتے کرتے گزار دی۔

میں اُن معاملات کو زیرِ بحث لانا نہیں چاہتا جو اس المیے کا موجب بنے اور جنہوں نے اُسے محبت کی ناکامی پیش کر کے اس سے جان کا مطالبہ کیا۔ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اس کی اقتصادی بدحالی ایک بہت بڑی دیوار بن کر اس کے راستے میں حائل ہو گئی اور اس کی ضرب رسیدہ خودداری ایک چٹان بن کر اس کے اور اس کی محبوبہ کے مابین آن کر کھڑی ہو گئی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ اس لڑکی کی نسبت کہیں اور ٹھہرا دی گئی اور یہ نوجوان ایک تاریک قنوطیت اور عجیب

سی مژمردہ بے نیازی میں بہہ نکلا۔ ان ہی دنوں اس نے اپنا پہلا فسانہ "خواب" لکھا جو ادبی دنیا میں تعریف کے ساتھ شائع ہوا۔ اس افسانے کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو یک لخت شمس کی زندگی کی وہ پُراسرار شام یاد آجاتی ہے جس نے اُسے انفرادیت سے بلند ہوکر آفاقیت کا تصور پیدا کرنے میں مددوی تھی اور اس طرح وہ اپنی ناکامیوں کو بعدازاں نظرانداز کرسکا تھا۔ پھر ان ہی ایام میں اس نے اپنا مشہور افسانہ "سراب" لکھا جو حُسن پر ایک ایسی لطیف طنز ثابت ہوا کہ اہلِ ذوق عش عش کر اٹھے۔ مختصر یہ کہ ان دنوں اس نے اپنی ناکامیوں سے جھنجلا کر، اکتا کر ادب کی آغوش کا سہارا لیا اور اپنے عزم میں کچھ حد تک کامیاب بھی رہا۔ لیکن آخرش کب تک؟ اسی دوران میں اس لڑکی کی شادی ہوگئی اور شمس نے خود کو ایک ایسے عجیب و غریب احساسی ردِعمل میں مبتلا پایا کہ ہزار کوشش پر بھی وہ اپنے آپ کو اس سے چھٹکارا نہ دلا سکا۔ اس وقت تک اس نے میرے سامنے اپنی محبت کا کبھی اعتراف نہیں کیا تھا لیکن اس شادی کے کچھ دن بعد ایک اداس سی شام کو، آنسوؤں اور سسکیوں کے درمیان اس نے اپنی مجروح شخصیت اور زخمی دل کو ننگا کرکے رکھ دیا۔ یہ ایک کہانی تھی، کہانی کیا تھی! اس کے اپنے احساسات و جذبات کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جسے وہ تاثروں میں، ٹکڑوں میں، آنسوؤں اور مسکراہٹوں کے درمیان بیان کرتا جا رہا تھا۔ اس کہانی میں بعض الجھنوں کا تذکرہ تھا۔ عورت کی نفسیات پر بحث تھی۔ کچھ اپنی مجبوریوں اور لغزشوں پر افسوس تھا۔ کچھ دوسروں کے اعمال کا شکوہ تھا۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس کہانی کا مجھے یوں سنایا جانا بھی ایک لطیف سا ردِعمل ثابت ہوا۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے لئے اس کی طبیعت بحال ہوگئی اور ذہن ہلکا!

مگر اسی دوران میں زندگی کی پے در پے شکستوں اور آلام و مصائب کی مسلسل یورشوں کے باعث اس کے لاشعور میں خود کو ختم کر دینے کی ایک تحریک بھی آہستہ آہستہ زور پکڑتی جا رہی تھی۔ بظاہر وہ اس کے وجود تک سے ناآشنا تھا لیکن اس کی بیشتر اوقات حادثات سے نبردآزمائی، اس کی نت نئی لغزشیں اور بے پروائیاں اسی نئی رَو کی مفصل طور پر غمازی کر رہی تھیں۔ کوئی دن ایسا نہیں جاتا تھا کہ اُسے کوئی نہ کوئی چھوٹا بڑا حادثہ پیش نہ آجاتا۔ قلم بناتے ہوئے یا کوئی اور کام کرتے ہوئے ہاتھوں کو زخمی کر لینا تو اس کا معمول ہوگیا تھا۔ شہر جاتا تو کسی نہ کسی تانگے گھوڑے سے ٹکرا جاتا۔ ایک بار شکار کے لئے کارتوس بناتے ہوئے بارود کو غیرارادی طور پر چولہے کے نزدیک لے گیا۔ اور

اپنی ٹانگوں، بازوؤں اور چہرے کو جُھلسا بیٹھا۔ غرضیکہ اس کا چلنا پھرنا، اُٹھنا بیٹھنا سب غیر ارادی ہو گیا تھا۔ ایک عجیب سی بے نیازی اور بے پروائی تے قدم جما لیئے تھے۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ سب حرکات لاشعوری طور پر خودکشی کرنے کے مترادف تھیں۔ اگرچہ شعوری طور پر وہ ابھی اس سے آشنا نہیں ہوا تھا لیکن مسلسل قنوطیت، آرزوؤں اور امیدوں کی موت اور ایک تاریک ماضی کے ہوتے ہوئے اگر آہستہ آہستہ یہ جذبہ شعوری سطح پر بھی آ گیا تو یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ اب وہ اکثر خودکشی کے بارے میں باتیں کرتا اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس مسئلے پر بڑی لمبی لمبی بحثیں ہو جایا کرتی تھیں۔ انہی دنوں اُس نے اپنا افسانہ "دلِ ناتواں" لکھا اور اپنے خیال اور ارادے کو درست ثابت کرنے کی ایک زبردست کوشش کی۔

خود کو ختم کر دینے کی یہ تحریک آہستہ آہستہ زور پکڑتی گئی۔ ہر صبح اس کے عزم کو قوی کرتی اور ہر شام وہ تاروں بھرے آسمان کے نیچے لیٹا اپنے آئندہ اقدامات کے متعلق سوچا کرتا اور پھر وہ واقعہ رُونما ہوا جس کا تصور کرتے ہوئے آج بھی میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ گرمیوں کی ایک اداس سی صبح تھی۔ میں اُٹھ کر باہر مردانے میں آیا تو دیکھا کہ وہ ابھی تک سو رہا ہے۔ نزدیک جا کر پکارا تو معلوم ہوا کہ سو نہیں رہا البتہ طبیعت کافی خراب ہے۔ میں نے اٹھنے کے لیئے کہا تو کہنے لگا "مجھے سہارا دے کر میرے کمرے تک پہنچا دو"۔ میں نے سہارا دیا اور وہ آہستہ آہستہ اپنے کمرے کی طرف چلنے لگا۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے پر زردی کے بڑے بڑے دھبے تھے اور یہی حال اس کی گردن اور ہاتھوں کا تھا۔ کمرے میں لے جا کر میں نے اسے پلنگ پر لٹا دیا اور پھر یک لخت میری نظریں قریب کی میز کی طرف اُٹھ گئیں اور میرے منہ سے چیخ نکل گئی۔ میز پر اس کے افسانے "صبح و شام" کا مسودہ پڑا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک سفید کاغذ پر جلی حروف میں لکھے ہوئے یہ الفاظ تھے "میں خودکشی کر رہا ہوں" اس کے پاس ہی چند خطوط پڑے تھے جو اس نے رات زہر کھانے سے قبل تحریر کیئے تھے۔ میری زندگی میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا اور میں نہیں جانتا تھا میں کیا کروں۔ معاً میں گھر والوں کو اطلاع دینے کے لیئے باہر کو لپکا لیکن اس نے مجھے سختی سے روک دیا: "کیا فائدہ؛ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اس میں میری نہیں کسی اور کی بدنامی ہوگی ___ رُک جاؤ، ٹھہر جاؤ!" اور میں رُک گیا۔ کمرے کے تمام دروازے اندر سے مقفل کر لیئے گئے اور اس پُر اسرار علاج کا آغاز ہوا جس نے اُسے اس روز بچا لیا۔ پوٹاشیم پرمیگنیٹ کے استعمال سے زہر آہستہ آہستہ

لیکن یقینی طور پر خارج ہوتا رہا۔ پورے دس گھنٹے میں اس کے ساتھ اس کمرے میں بند رہا۔ ان دس گھنٹوں میں اس پر غنودگی اور نیند کے کئی بڑے بڑے حملے ہوئے لیکن یہ جانتے ہوئے کہ اگر وہ ایک بار سو گیا تو پھر کوئی طاقت اسے بیدار نہ کر سکے گی، میں نے اُسے سونے نہیں دیا۔ شام تک وہ خطرے سے باہر ہو گیا تھا۔

میں اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ لیکن اس کے لئے یہ ایک بہت بڑی شکست تھی۔ اپنی زندگی کے پہلے دور میں اس نے زندہ رہنے کے لئے ایک بے پایاں جد و جہد کی تھی لیکن زمانے نے اسے جھٹک کر پرے پھینک دیا تھا۔ اب اس نے مرنے کی آرزو کی تو موت نے آنکھیں چرالیں۔ ان ہی دنوں اس نے اپنا نفسیاتی شاہکار "شکست" لکھا جو ملک کے طول و عرض میں پسند کیا گیا لیکن اس شکست کے بعد اس پر ایک عجیب قسم کی بے حسی اور مردنی چھانے لگی۔ وہ اب ایک چلتی پھرتی لاش تھا۔ نہ وہ جوش، نہ وہ تن من میں آگ سی لگی ہوئی، نہ طنز، یہ قہقہے اور نہ حزیں مسکراہٹ — وہ تو گویا اب ایک پتھر کا بُت تھا — اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ ایک لمبی داستان ہے اور آپ اس سے اکتا بھی سکتے ہیں۔ مختصر یہ کہ اگرچہ اس کے بعد بھی اس کی زندگی میں مد و جزر آئے اور وہ کتنی ہی بار زندگی اور موت کے مابین بھی لٹکا لیکن وہ بے حسی اور مردنی جو ایک بار چھا گئی تھی، ہمیشہ قائم رہی۔ میں اُسے مجبور کر کے کشمیر لے گیا۔ خیال تھا کہ جگہ کی تبدیلی سے خیالات و احساسات میں بھی تبدیلی آجائے گی۔ اور شاید قنوطیت کے یہ تاریک بادل بھی چھٹ جائیں۔ لیکن ناممکن وہ تو بے زار ہو چکا تھا۔ اپنے سماجی اور سیاسی نظام سے، اپنی جد و جہد اور مستقبل کے خوابوں سے اپنی دنیا اور کائنات سے — آخر انسان کران پھیکے پھیکے منہ چڑاتے ہوئے تاروں سے کیا فائدہ اس بے معنی وسعت سے کیا حاصل؟ آخر کب تک ہم پتلیوں کی طرح ناچتے چلے جائیں گے۔ اپنے مغرور خدا کے مجبور بندے چیختے چلاتے موت کے پردے میں چھپ جائیں گے؟

اور پھر اس ڈرامے کا ڈراپ سین آیا۔ جس طرح بجھتے ہوئے چراغ کی لَو یک لخت تیز ہو جاتی ہے۔ اُس نے بھی آخری سنبھالا لیا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں وہی پرانی چمک آگئی اور ہونٹوں پر مدتوں کا کھویا ہوا تبسم جھلملانے لگا۔ اس کی حرکات میں ایک اضطراری کیفیت، اس کے خیالات میں ایک عجیب سی تیزی آگئی۔ وہ یکایک کھل اٹھا۔ گویا اُسے کوئی خزانہ مل گیا تھا۔ گویا۔

اس نے اب تک جو کچھ دیکھا یا محسوس کیا تھا محض ایک خواب پریشان تھا۔ اب وہ ہر کام نہایت عجلت سے کر رہا تھا جیسے وہ جلد سے جلد فارغ ہو کر اپنی منزل کو روانہ ہو جانا چاہتا ہو۔ اس کی حالت اس مسافر کی سی تھی جسے ریل پر سوار ہونا ہو اور ریل سیٹی دے رہی ہو — اور پھر وہ تاریخی دن آیا۔ اُس روز میں اور وہ اکھٹے لاہور گئے تھے اُسے اپنے افسانوں کا مسودہ مولانا صلاح الدین احمد کے حوالے کرنا تھا۔ یہ کام ہو چکا تو وہ اتنا خوش نظر آنے لگا کہ مجھے اس کی مسرت مصنوعی سی معلوم دی۔ یہ ۳ دسمبر ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے۔ اُسی شام وہ دفعتاً غائب ہو گیا تیسرے روز دہلی سے اُس کا آخری خط آیا۔ یہ خط آج بھی میرے پاس محفوظ پڑا ہے اور اس کے خطرناک عزم کی غمازی کرتا ہے — دو دن بعد میرے نام ایک رجسٹرڈ پارسل آگیا۔ اس پارسل میں بہت دور جانے والے مسافر کے چند آخری تحفے تھے۔ لیکن یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ کیا تھے اور کس کے لئے تھے!

مولانا سے میری پہلی ملاقات

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب آتش نے تازہ تازہ جوانی میں قدم رکھا تھا اور دوسری جنگِ عظیم اپنے آخری مراحل میں داخل ہو گئی تھی۔ میں کالج سے تو فتح کے پرچم لہراتا ہوا برآمد ہوا تھا لیکن "بے کاری" کی وسیع تر جنگ کے پہلے ہی وار میں کھیت ہو گیا تھا اور زندگی ایک کربناک حقیقت میں ڈھل کر میرے سامنے آگئی تھی۔ میں نے کالج میں جو مضمون خصوصی مطالعہ کے لئے منتخب کیا تھا، اس کا دائرہ عمل بہت تنگ تھا یعنی بجز اقتصادی بہبود اس کے سامنے اور کوئی مقصد نہیں تھا۔ لیکن جب ایک طویل بے کاری اور ابھرتے ہوئے تاریک مستقبل کے سامنے اقتصادی بہبود کے جملہ اصول کھسیانے ہو کر رہ گئے تو میں "نروان" حاصل کرنے کے لئے کسی گھنے چھتنار کی تلاش میں کھو گیا۔ حسنِ اتفاق سے اُن ہی ایام میں میرا ایک بھانجا جو میرا ہم عمر تھا) اپنی تعلیم کے سلسلے کو منقطع کر کے اُس زمانے کی عام روش کے احترام میں بالکل "بے کار" ہو گیا تھا۔ ہم دونوں ایک طویل مدت کے بعد اپنے آبائی گاؤں میں اکٹھے ہوئے اور پھر اُس سلسلے کا آغاز ہوا جسے میرے نیک بخت بھانجے نے تو دو ہی برس میں ترک کر دیا لیکن جسے میں نے زندگی بھر کے لئے حرزِ جاں بنا لیا یعنی ان دنوں ہم ادب بالخصوص اردو ادب میں پوری دلچسپی لینے لگے۔ میرے اس بھانجے کا نام شمس آغا تھا اور وہ گاؤں میں وارد ہونے سے پہلے ہی لمبے چوڑے بے سر و پا افسانے لکھ کر گھر بھر میں بدنام ہو چکا تھا۔ اس وقت تک میں نے اقتصادیات کے سوا اور کچھ پڑھا

؎ مولانا صلاح الدین احمد

نہیں تھا۔ اس لئے نہ صرف شمس سے متاثر ہوا بلکہ ادب نے مجھے وہ گہرا میٹھا سایہ بھی مہیا کر دیا جس کی مجھے ایک مدت سے تلاش تھی۔ یہ ۴۴-۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے۔ ان ہی ایّام میں شمس نے خلافِ معمول اور خلافِ توقع ایک نہایت خوبصورت افسانہ لکھا جس کا عنوان تھا "خواب" اور ہم دونوں نے طویل کانفرنسوں کے بعد (جو نہر کے کنارے منعقد ہوئیں) اسے قابلِ اشاعت قرار دے ڈالا۔ ان دنوں ہم پر ادبی دنیا چھایا ہوا تھا اور ہمارے لئے کسی شے کا ادبی دنیا میں چھپ جانا نوبل پرائز حاصل کرنے کے اعزاز سے کسی طور کم نہ تھا۔ ادبی دنیا ماہنامہ تھا لیکن ہمیشہ ذرا تاخیر سے چھپتا تھا۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ مہینے کی پندرہ بیس یا حد پچیس تاریخ تک ضرور آجاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ہم اس پرچے کا اس طور مطالعہ کرتے تھے کہ پرنٹ لائن سے لے کر اشتہارات تک کر پڑھ جاتے تھے اور پرچے کے اصل مندرجات کے علاوہ ہمیں ان غیر ادبی حصّوں میں بھی ایک خاص ذائقہ محسوس ہوتا تھا۔ ادبی دنیا کے ہر شمارے کو ہم اتنی بار اور اس توجہ سے پڑھتے تھے کہ تقریباً سارا پرچہ ہمیں حفظ ہو جاتا تھا۔ اس پرچے کے مدیر کے بارے میں تو ہم اکثر باتیں کرتے ہمارے لئے وہ ایک اتنی عظیم شخصیت تھے کہ انہیں قریب سے ایک نظر دیکھنا ہماری زندگیوں کا حسین ترین خواب بن چکا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ نہر کنارے سیر کرتے ہوئے شمس نے کہا تھا۔ "کاش وہ دن آئے جب مولانا صلاح الدین احمد بھی ہماری اس سیر میں شریک ہوں" اور میں نے بڑی مایوسی سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ کیسے ممکن ہے" اور بات ختم ہو گئی تھی۔ اس واقعہ کے تقریباً سترہ برس بعد اسی نہر کے کنارے مولانا کے ساتھ سیر کرتے ہوئے میں نے انہیں شمس آغا مرحوم کی آرزو اور اپنے تشکک کا قصّہ سنایا تو مولانا ہنسے نہیں بلکہ یکلخت چُپ ہو گئے اور ان پر گہری اُداسی مسلّط ہو گئی۔ کیوں؟ لیکن یہ ایک الگ داستان ہے:

بہرکیف افسانہ "خواب" کی ترسیل کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ تیاری میں نے اس لئے کہا کہ واقعتاً اسے اس دولہا کی طرح تیار کیا جاتا تھا جسے یقین نہ ہو کہ اس کی بارات اپنے مشن میں کامیاب بھی ہو سکے گی یا نہیں شمس نے متعدد بار اسے لکھا اور اتنی ہی بار میں نے اس پر نظرِ ثانی کی۔ ہم پر مولانا کی شخصیت کا رعب اس قدر طاری تھا کہ جب نظرِ ثانی میں کاٹ کے کی قسم کی تبدیلی کر دی جاتی

تو شمس سارے افسانے کو از سرِ نو صاف کر کے لکھتا۔ پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ افسانے کی نوک پلک سنور چکی تھی اور وہ ترسیل کے لئے بالکل تیار تھا۔ ہم نے بڑی احتیاط سے مسودے کو ایک خوبصورت لفافے میں بند کیا اور پھر ہم دونوں دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ اسے دیہاتی پوسٹ ماسٹر کے پاس لے گئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب وہ لفافے پر مہر لگانے لگا تو ہم دونوں نے بے اختیار اور یک زبان ہو کر کہا تھا۔ "ماسٹر صاحب ذرا آہستہ مہر لگایئے اس میں ادبی دنیا کا مسودہ بند ہے۔" اور ماسٹر صاحب نے یوں حیران ہو کر ہماری طرف دیکھا تھا جیسے ہم پاگل ہو گئے ہوں۔

اور ہم واقعی "پاگل" ہو گئے تھے۔ افسانہ پوسٹ کرنے کے فوراً بعد ہم نے جواب کا انتظار شروع کر دیا۔ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہم اس افسانے کا ذکر کرتے۔ ہمارا خیال تھا کہ اِدھر یہ افسانہ دفتر ادبی دنیا میں پہنچے گا۔ اُدھر مولانا اسے پڑھ ڈالیں گے اور پھر؟ لیکن یہ "پھر" ایک بڑا سوالیہ نشان تھا اور ہم شکست و کامرانی کے جھولے میں لگاتار جھول رہے تھے۔ ایک ہفتہ گذر گیا۔ کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ خط لکھ کر یاد دہانی کرانے کی کسے جرأت تھی؟ پھر دو ہفتے بیت گئے پھر ایک ماہ گذر گیا۔ یاسیت کی ایک ٹھنڈی رَو ہم میں سرایت کرتی چلی گئی۔ اب ہم اکثر سیر کے دوران میں بالکل خاموش رہتے۔ تمام امنگیں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں۔ کبھی کبھی شمس کہتا۔ "افسانہ ڈاک ہی میں ضائع نہ ہو گیا ہو۔" لیکن اُن دنوں ڈاک ضائع نہیں ہوا کرتی تھی۔ اس لئے اس قسم کے شک و شبہ میں کوئی وزن نہ تھا۔ دو ماہ گذر گئے اور اس کے بعد ایک اور مہینہ دبے پاؤں گزرنے لگا اور تب ایک روز شمس کے نام ایک اجنبی سا خط آیا۔ ہم نے بیتاب ہو کر لفافہ چاک کیا۔ ایک نظر مندرجات پر ڈالی اور ہماری آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔ مولانا نے افسانے کو قابلِ اشاعت قرار دیا تھا اور شاید ایک آدھ فقرے میں اس کی کچھ تعریف بھی کی تھی لیکن ہمارے لئے یہ ایک بہت بڑی فتح تھی۔ مولانا جس افسانے کو پسند کر لیں وہ ایک عظیم شاہکار سے کیا کم ہو گا! معاً ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم چند ہی روز میں گمنامی کی فضا سے نکل کر شہرت کے آسمان پر پہنچ جائیں گے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اگرچہ افسانہ شمس نے لکھا تھا لیکن فتح کے احساس میں میں پوری طرح شریک تھا۔ اس واقعہ کے کچھ دن بعد یہ افسانہ ادبی دنیا میں شائع ہو گیا۔

"بزمِ ادب" میں مولانا نے افسانے کی خاصی تعریف کی تھی۔ یکایک شمسؔ کے لکھنے کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس نے جلد ہی "سراب" لکھا۔ اس کے بعد "صبح و شام" اور چند ہی روز بعد اپنا شاہکار "شکست"! مولانا نے اُن دنوں شمس کو دو طویل خط لکھے۔ افسوس کہ یہ خط شمسؔ کے ساتھ ہی فنا ہوگئے لیکن ان خطوں نے ہم پر نہایت گہرے اثرات مرتسم کئے۔ مولانا جو ہر قابل کی دریافت اور پھر اسے چمکانے کے فن میں یکتا تھے اور اب انہوں نے ایک گمنام افسانہ نگار کو شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ مولانا کے خطوں سے معلوم ہوا کہ سارے ہندوستان سے شمسؔ کے افسانوں کی تعریف میں خطوط کا ایک سیلاب اُمڈا چلا آ رہا ہے۔

میں انہی ایام میں ایک روز لاہور گیا۔ شاید کوئی نجی کام تھا۔ اخبار میں پڑھا کہ مولانا حسرت موہانی تشریف لائے ہوئے ہیں اور وہ پچھلے پہر وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال میں اردو غزل کے بارے میں ایک تقریر کریں گے۔ میں نے جلدی جلدی اپنے کام سے فراغت حاصل کی اور وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کی طرف چل دیا۔ جب وہاں پہنچا تو ہال تقریباً بھر چکا تھا۔ مجھے سب سے آخری بینچ کے ایک کونے میں جگہ مل گئی یہ بھی غنیمت تھا کیوں کہ جلد ہی میرے پیچھے لوگوں کی قطاریں ابھرنا شروع ہوگئیں۔ اتنے میں ایک بھاری بھرکم صاحب سٹیج کی سیڑھیاں چڑھ کر مائک کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ انہیں دیکھتے ہی ہال میں مکمل خاموشی چھاگئی۔ تب انہوں نے نہایت شُستہ اور رواں دواں زبان میں مولانا حسرت کے بارے میں کچھ کہنا شروع کیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے پاس ہی ایک لمبی لمبی زلفوں والے آوارہ حال صاحب تشریف فرما تھے۔ میں نے ان کے کان سے اپنا منہ لگاکر پوچھا— "یہ کون صاحب ہیں؟" "وہ" انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بڑی بھاری آواز میں بولے، "آپ کو معلوم نہیں؟ وہ مولانا صلاح الدین احمد ہیں۔" اس وقت تو مجھے کچھ علم نہ تھا لیکن بعدازاں جب میں نے میراجی کی تصاویر دیکھیں تو میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ اس روز میری رہبری کرنے والے میراجی تھے۔ میراجی سے یہ میری پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

مولانا کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس قدر بھاری بھرکم ہوں گے اور پھر ان کے چہرے پر اتنی بڑی بڑی مونچھیں بھی ہوں گی۔ مگر مولانا بول رہے تھے، اور ان کی گفتگو میں اتنی شیرینی، سلاست اور روانی تھی کہ جی یہی چاہتا تھا کہ وہ بولتے چلے جائیں اور یہ محفل کبھی

اختتام پذیر نہ ہو۔

اس واقعہ کے کئی ماہ بعد جب شمسؔ کے متعدد افسانوں کی اشاعت اور مولانا کی حوصلہ افزائی سے ہمیں کچھ "اعتماد" حاصل ہوا تو ہم نے لاہور جا کر مولانا سے ملاقات کرنے کا پروگرام بنایا۔ لاہور پہنچے تو مولانا کے دفتر کی تلاش ہوئی۔ کسی نے بتایا کہ ادبی دنیا کا دفتر مال روڈ سے کسی اور جگہ منتقل ہو گیا ہے۔ کہاں؟ اس بات کا علم کسی کو بھی نہیں تھا۔ ہم پوچھتے پوچھتے چوک انار کلی جا پہنچے۔ وہاں مکتبۂ اردو کی ایک چھوٹی سی دکان سے پتہ چلا کہ ادبی دنیا کے بارے میں اردو بک سٹال سے معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ لوہاری دروازے کے عین باہر یہ کتابوں کی ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ دکان کے تھڑے پر ایک صاحب مونڈھے میں دھنسے ہوئے کوئی مسودہ درست کر رہے تھے۔ ہم نے بصد ادب ان صاحب سے ادبی دنیا کا پتہ پوچھا تو انہوں نے ایسے شک وشبہ سے ہمارا جائزہ لیا کہ ہمیں محسوس ہوا جیسے یہ صاحب اردو بک سٹال سے نہیں بلکہ کسی قریبی تھانے سے متعلق ہیں۔ تب نہایت اکھڑے لہجے میں انہوں نے سوال کیا۔ "آپ لوگ دفتر ادبی دنیا سے کیا چاہتے ہیں؟" ہم نے عرض کیا۔ "مولانا سے ملنے کے آرزومند ہیں۔" "کیوں؟" ان صاحب نے تقریباً چیخ کر کہا۔ "کیوں ملنا چاہتے ہیں آپ؟" ہمارے پاس اس نہایت معقول سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس لئے میں نے لرزتی ہوئی آواز میں اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فقط اتنا کہا۔ "یہ شمس آغا ہیں۔" "ہوں! تو یہ شمسؔ آغا ہیں۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔ تب بولے "دیکھئے آپ یوں کیجئے کہ اِدھر سے ہو کر اُدھر اور پھر اُدھر سے ہو کر ادھر یوں چلے جائیے اور وہاں سے یوں ہو کر اِدھر چلے آئیے۔" ادھر اور اُدھر کے ساتھ انہوں نے بعض گلیوں اور محلوں کے نام بھی لئے تھے لیکن میں تو فقط ان کے ہونٹوں کے جزر و مد کو دیکھ رہا تھا اور شمسؔ اپنی ڈائری میں یہ تمام پُراسرار نام نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ تقریر ختم کرنے کے فوراً بعد وہ اپنے مسودے پر جھک گئے۔ ہم نے اب وہاں مزید ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا اور چل پڑے۔ مگر چلتے چلتے میں نے جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان صاحب سے پوچھ ہی لیا۔ "جناب آپ کا اسم شریف؟" "قیوم نظر!!!" انہوں نے اس زور سے کہا کہ مجھے محسوس ہوا گویا قریب ہی کوئی بم پھٹ گیا ہے۔ چنانچہ ہم وہاں سے واقعتاً سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

قیوم نظر صاحب کی تقریر کا لبّ لباب یہ تھا کہ دفتر ادبی دنیا اب میکلوڈ روڈ پر آگیا ہے۔ باقی تقریر میں انہوں نے میکلوڈ روڈ تک پہنچنے کے تمام ممکن اور ناممکن راستوں پر مفصّل تبصرہ کیا تھا۔ بہر کیف ہم نے ان کے اشارات پر عمل کرتے ہوئے میکلوڈ روڈ کو ڈھونڈ لیا اور پھر ان دکانوں کو بھی تلاش کر لیا جن میں دفتر ادبی دنیا سنیڈورچ حالت میں پڑا تھا۔ ہم چق اٹھا کر اندر داخل ہو گئے۔ کمرے کے عین درمیان ایک بڑی سی فرسودہ میز پڑی تھی جسے چند فرسودہ سی کرسیاں گھیرے کھڑی تھیں۔ کمرے کے ایک کونے میں ایک بے حد خستہ چٹائی پر ایک بارلیش کاتب تشریف فرما تھے۔ اس کے علاوہ وہاں سناٹا تھا۔ ہم نے کاتب صاحب سے مولانا کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے ہمیں چِٹ پر اپنے نام لکھنے کے لئے کہا۔ میں نے کاغذ کے ایک پرزے پر "شمس آغا" کا نام لکھ کر انہیں تھما دیا۔ وہ کمرے کے اندر لکڑی کے ایک حجرے میں داخل ہو گئے۔ تب ہمیں محسوس ہوا کہ لکڑی کے اس حجرے میں سے دبے دبے قہقہوں کی آوازیں آ رہی ہیں اور چینی کے برتن آپس میں ٹکرا رہے ہیں۔ بہت عرصہ بعد مجھے معلوم ہوا کہ اس وقت مولانا اور ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی حسبِ معمول حجرے میں بند چائے پی رہے تھے لیکن ادھر چِٹ اندر گئی ادھر مولانا لپک کر باہر آ گئے۔ باہر آ کر ایک کے بجائے دو نوجوانوں کو اپنے سامنے پا کر یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ ہم میں سے شمس آغا کون ہے۔ میں نے ان کی اُلجھن کو محسوس کرتے ہوئے شمس کا تعارف کرایا۔ مولانا نے بڑے تپاک سے ہم دونوں سے مصافحہ کیا یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک نہایت پُرخلوص انسان سے مل رہا ہوں۔ ان کے ہاتھ کے لمس میں محبت اور خلوص کی ایک برقی رو چھپی ہوئی تھی۔ مولانا مسکرا رہے تھے۔ مسرّت ان کی آنکھوں سے چھلک رہی تھی۔ شمس کو مخاطب کر کے بولے۔ "آپ شاید حیران ہوں لیکن آپ کے افسانوں کے مطالعہ سے میرے ذہن نے آپ کی جو تصویر مرتب کی تھی، آپ اُس کے عین مطابق ہیں" شمس کا رنگ سفید تھا لیکن اس وقت اس کا چہرہ بالکل سُرخ ہو گیا تھا اور وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں نجانے کیا کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم بمشکل پانچ منٹ مولانا کے پاس بیٹھے اور پھر ایک سلقہ کھڑے ہو کر اجازت طلب کی" ابھی سے؟" مولانا نے حیران ہو کر پوچھا کیونکہ ادباء کے بارے میں ان کا تجربہ اس سے قطعاً مختلف تھا لیکن ہم اس نایاب ملاقات کے تاثر کو رقیق کرنا نہ

چاہتے تھے۔ دوسرے اب ہماری مسرت ایک انتہائی نقطے پہ پہنچ گئی تھی اور اس سے زیادہ کی ہمیں تاب نہ تھی۔ ہم چق اٹھا کر باہر آ گئے۔ معاً مجھے محسوس ہوا کہ دنیا ہی بدل گئی ہے ہر شخص ہمیں غور غور سے تک رہا ہے، جیسے ہم کسی اور ستارے سے زمین پر نازل ہو گئے ہوں میں نے اپنے سینے میں مسرت کے طوفان کو دباتے ہوئے آسمان کی طرف نظر اٹھائی۔ تپتی ہوئی دوپہر میں گدلا آسمان دُور دُور تک پھیلا ہوا تھا مگر اس آسمان کے درمیان، عین درمیان ایک سفید سا لکۂ ابر نمودار ہو گیا تھا۔

مولانا سے میری آخری ملاقات

مولانا سے آخری ملاقات ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ میں سرگودھا سے لاہور پہنچا تو وہ حسبِ معمول ہشاش بشاش تھے۔ ہم لوگ دوپہر ایک بجے تک دفتر 'ادبی دنیا' میں بیٹھے کام کرتے رہے۔ پھر کھانا کھانے چلے گئے۔ کھانے کے دوران میں مولانا نے بتایا کہ انہیں بلڈ پریشر کی تکلیف کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے اور ڈاکٹروں نے نمک منع کر دیا ہے۔ ہنس کر کہنے لگے: "پہلے ان لوگوں نے شکر منع کر دی تھی۔ اب نمک سے بھی محروم کر دیا ہے۔ کل حکم ملے گا پانی پینا بھی چھوڑ دو۔ لیکن آج میں پرہیز نہیں کروں گا۔" چنانچہ انہوں نے شاید کئی روز کے بعد خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ باتیں کرتے ہوئے مولانا کے گرد مسرت اور طمانیت کا ایک روشن ہالہ اُس روز بھی موجود تھا اور یہ بات میرے لئے باعثِ اطمینان تھی۔ لیکن پھر اچانک جیسے چاند بدلی میں چلا جائے۔ مسرت کی یہ فضا گہری تاریکی میں گم ہوگئی۔ مولانا یکایک خاموش ہوگئے اور کئی منٹ تک گم سم ٹکٹکی باندھے سامنے کی سفید دیوار کو گھورتے رہے۔ میں نے پچھلے بیس برس میں انہیں کبھی اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ پھر جب وہ بولے تو اُن کی آواز سرگوشی کی سطح سے بلند نہیں تھی۔ کہنے لگے "میں چاہتا ہوں کہ جلد ہی ایک وصیت نامہ تحریر کر دوں تاکہ میرے بعد 'ادبی دنیا'، اور اردو فاؤنڈیشن محفوظ ہاتھوں میں رہیں خدا کا شکر ہے کہ میں اس بارے میں اب کسی گومگو کے عالم میں نہیں ہوں۔" مولانا جب کبھی 'آنے والی ساعت' کا ذکر کرتے تو میں ہمیشہ بات کا رُخ بدلنے کی کوشش کرتا اور کچھ نہیں تو ان کی پیالی میں ڈھیر سی چینی انڈیل دیتا اور وہ سب کچھ بھول کر ہنستے اور احتجاج کرتے ہوئے پیالی کی طرف

متوجہ ہو جاتے لیکن اُس روز مولانا نے کسی ایسی بات کی طرف توجہ ہی نہیں دی اور بڑی دیر تک اپنے کام کی جہت کے بارے میں ایسی باتیں کرتے رہے جو اس روز سے قبل انہوں نے کبھی نہ کی تھیں۔ یہ باتیں آج بھی میرے دل پر نقش ہیں۔

میں جب مولانا کے بارے میں سوچتا ہوں، مجھے ان کی شخصیت کے دو رُخ نمایاں طور پر ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اُن میں سے ایک رُخ تو ملائمت، لچک، اغماض و درگذر، ہمدردی اور کشادہ دلی سے اور دوسرا، ارادے کی پختگی، ثابت قدمی اور خطر پسندی سے عبارت ہے اور جب تک ان دونوں رُخوں کا ایک ساتھ جائزہ نہ لیا جائے مولانا کی شخصیت کے سارے خد و خال نظر کے سامنے نہیں آسکتے۔ اتفاق دیکھئے کہ مجھے مولانا کی شخصیت کے ان دونوں رُخوں کو قریب سے دیکھنے کے لاتعداد مواقع ملے ہیں اور آج کہ مولانا کی برسی ہے وہ تمام واقعات میری طرف لپکتے چلے آرہے ہیں جو مولانا کی شخصیت کے ان دونوں پہلوؤں سے متعلق تھے۔ مولانا اپنی شخصی حیثیت میں ملائمت اور محبت کا سرچشمہ تھے۔ اُن کی کشادہ دلی کا یہ عالم تھا کہ دوسروں کی بے اعتنائی حسد اور بدتمیزی تک کو ہنس کر برداشت کر لیتے تھے۔ کہتے "مجھے ان لوگوں کی حالت پر رحم آتا ہے"

مجھے یاد ہے مولانا کے ایک کرم فرما جو آج دنیاوی اعتبار سے خاصے اُونچے مقام پر فائز ہیں اپنی بے کاری کے ایام میں ایک میلا سا ہینڈ بیگ اٹھائے صبح سویرے ہی مولانا کے دفتر میں وارد ہو جایا کرتے تھے۔ اور سارا سارا دن وہیں تشریف فرما رہتے تھے حتیٰ کہ مجبوراً مولانا کے کھانے میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ پھر مولانا نے بڑی تگ و دو کے بعد انہیں ایک اعلیٰ دنیاوی منصب دلا دیا لیکن وہ جلد ہی مولانا کے سب احسانات کو فراموش کر گئے۔ مولانا ان کے ہر وار کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے اور کبھی اپنے احسانات کا ذکر تک کرنا بھی مناسب نہ سمجھا لیکن ایک روز نجانے کیا ہوا، شاید ان حضرت نے کوئی تازہ وار کیا تھا کہ مولانا کہنے لگے "دیکھو۔ یہ شخص اب کس قدر خوشحال ہے لیکن اس کے حسد کا آج بھی یہ عالم ہے کہ جب کبھی میں اس سے اپنے کسی بیٹے یا ادارے سے متعلق کوئی خوشخبری سناتا ہوں تو یہ اپنی تھوک نگلتا ہے اور اس کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے"۔ لیکن یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مولانا نے اپنے اس کرمفرما سے خوشگوار تعلقات قائم رکھے اور کبھی اس سے کسی بات کا شکوہ تک نہیں کیا۔ عام زندگی میں

بھی مولانا کے ہاں قوتِ برداشت کی حیرت انگیز فراوانی تھی۔ وہ اپنی علالت کے پیشِ نظر ادبی محفلوں میں جانے سے کتراتے تھے لیکن جو شخص بھی اس سلسلے میں اُن کے ہاں ایک بار چلا گیا، وہاں سے مایوس ہو کر نہ لوٹا۔ وہ پہلے تو بڑی ملائمت سے انکار کرتے، اپنی علالت کا حوالہ دیتے، اپنی مصروفیات کی ایک ایک پرت کھول کر اُس کے سامنے رکھ دیتے اور پھر اچانک محفل میں شریک ہونے سے صاف انکار کر دیتے لیکن آخر میں مان جاتے تھے۔ بس ادھر نووارد کے چہرے پر مایوسی کی ایک ہلکی سی لہر نمودار ہوئی اور ادھر مولانا کا دل پسیج گیا۔ وہ کسی کو دکھی حالت میں تو دیکھ ہی نہ سکتے تھے۔ اسی جذبے کے تحت انہوں نے اپنی شدید علالت کے باوجود قبولا میں جا کر مضمون پڑھنا قبول کر لیا اور پھر وہاں سے زندہ سلامت واپس نہ آسکے۔ مولانا کو گرد سے سخت نفرت تھی۔ جوانی کے ایام میں وہ اپنے بڑے بھائی کے پاس گجرات کاٹھیاواڑ میں کچھ عرصہ مقیم رہے اور وہاں انہوں نے کپڑے کے ایک کارخانہ میں کپڑا بُننے کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ٹیکسٹائل مل کے اندر گرد کی جو ایک دبیز سی چادر تن جاتی ہے۔ اس نے مولانا کے اعصاب کو بُری طرح متاثر کیا۔ انہوں نے ملازمت تو چھوڑ دی لیکن اس کے بعد باقی تمام عمر گرد سے خائف رہے۔ پاکستان کے ایک سنگلاخ شہر کے باسی انہیں ہر سال مجبور کر کے اپنے شہر میں لے جاتے تھے، اور مولانا ہر بار واپسی پر بآوازِ بلند یہ کہتے سنائی دیتے کہ اگلے برس وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ لیکن اگلے برس پھر چلے آتے۔ ایک دفعہ تو انہوں نے خود پر جبر کر کے اس شہر کے ایک باسی سے کہہ ہی دیا "بھائی! اب میں یہاں نہیں آؤں گا۔ یہاں گرد بہت زیادہ ہے۔" جب اُدھر سے جواب ملا کہ جناب ہم تو اس گرد کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ تو مولانا مسکرانے لگے اور اس شہر کا سالانہ پھیرا جاری رہا۔ دراصل مولانا کسی کا دل توڑنا تو جانتے ہی نہیں تھے۔ چنانچہ اکثر و بیشتر دوسروں کی خوشنودی پر اپنی مسرت، آرام اور فراغت کو قربان کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ میں ان کے دفتر میں پہنچا تو میز پر جھکے بڑے انہماک سے کوئی مضمون لکھ رہے تھے۔ پاس ہی ٹیلیفون کا ریسیور پڑا تھا۔ وہ ہر دو منٹ کے بعد ریسیور اٹھاتے اور "خوب! بہت خوب! سبحان اللہ!" کہہ کر ریسیور میز پر رکھ دیتے اور پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ میں کوئی دس منٹ تک یہ تماشہ دیکھتا رہا اور پھر میں نے حیران ہو کر

پوچھا کہ مولانا یہ کیا قصہ ہے؟ کہنے لگے "مجھے ریڈیو والوں کے لئے یہ مضمون آج ہی ختم کرنا ہے اور (ٹیلیفون کی طرف اشارہ کر کے) حکیم احمد شجاع مجھے صبح سے اپنے اشعار سنا رہا ہے۔ بتایئے میری حالت قابلِ رحم ہے یا نہیں؟"۔ لیکن اس قسم کے واقعات تو انہیں تقریباً ہر روز پیش آتے تھے۔ ایک دن میں نے انہیں ریگل کے سامنے فٹ پاتھ پر ایک صاحب سے مصروفِ گفتگو دیکھا تو رُک گیا تاکہ وہ فارغ ہو جائیں تو انہیں اپنی موجودگی کی اطلاع دوں۔ آدھ گھنٹے کے انتظار کے بعد مجھ سے نہ رہا گیا اور میں مولانا کے قریب چلا آیا۔ دیکھا کہ حضرت ع۔ر۔ا انہیں گھیرے کھڑے ہیں اور باآوازِ بلند جھوم جھوم کر اپنے اشعار سنا رہے ہیں۔ بعدازاں مولانا نے لطف لیتے ہوئے کہا "یہ صاحب اگر مجھے محض اپنے اشعار ہی سُناتے تو کوئی بات نہ تھی ظلم یہ ہے کہ وہ ساتھ ساتھ اپنے اشعار کا مطلب بھی سمجھا رہے تھے"۔ لیکن یہ مولانا کی طبعی شرافت تھی کہ وہ ایسے موقعوں پر بے رُخی کا مظاہرہ کر ہی نہیں سکتے تھے اور بڑی خاموشی سے ہر بات سہہ جاتے تھے۔ اس سلسلے میں مجھے دو اور لطیفے یاد آ گئے۔ تقسیم کے بعد جب لاہور اورینٹل کالج میں ایم اے اُردو کی ابتدا ہوئی تو کالج کے ایک اُستاد نے مولانا کو مشورہ دیا تھا کہ موقعہ نہایت شاندار ہے آپ بھی لگے ہاتھوں ایم اے کر لیجئے! مولانا نے ان صاحب سے تو فقط اتنا ہی کہا کہ کیوں نہیں ایسے شاندار مواقع کیا روز روز نصیب ہوتے ہیں لیکن بعدازاں وہ ہمیں یہ واقعہ سنا کر بہت محظوظ ہوتے تھے۔ دُوسرا واقعہ لاہور کی مال روڈ کا ہے جو ان دنوں ابھی قائدِاعظم کے نام سے منسوب نہیں ہوئی تھی۔ ایک روز مولانا حسبِ معمول مال کے فٹ پاتھ پر خراماں خراماں بڑے ڈاکخانے کی طرف جا رہے تھے کہ ان سے چند قدم آگے ایک تانگہ اچانک رُکا اور اس کی پچھلی سیٹ سے ایک صاحب نے مولانا کو آواز دے کر کہا۔ "مولانا آپ کے پاس ایک اٹھنّی ہے؟" مولانا نے ایک لفظ کہے بغیر جیب سے اٹھنّی نکال کر ان صاحب کے ہاتھ پر رکھ دی اور وہ آناً فاناً نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مولانا نے جب مجھے یہ قصہ سنایا تو لطف لیتے ہوئے کہا کہ ان حضرت نے نہ تو سلام دعا سے بات کا آغاز کیا اور نہ اٹھنّی لینے کے بعد شکریہ یا خدا حافظ کہا۔ کوئی اور دیکھتا تو شاید یہی خیال کرتا کہ میں ان کا مقروض تھا اور بڑی تگ و دَو کے بعد آج ان کی گرفت میں آیا تھا جب میں نے ان صاحب کا نام پوچھا تو مولانا ہنسنے لگے۔ انہیں نام بتانے سے اجتناب تھا۔ بعدازاں جب میرا اصرار بڑھا تو مولانا نے مسکرا کر فقط اتنا کہا ——— سعادت حسن منٹو!

یہ تو تھا مولانا کی شخصیت کا ایک رُخ! دوسرا رُخ ایک عجیب سی توانائی، ثابت قدمی اور ارادے کی پختگی سے عبارت تھا۔ وہ شخصی سطح پر تو ہر نئی صورتِ حال کے مطابق اپنے اندر لچک پیدا کر لیتے تھے لیکن جب اصول یا نقطۂ نظر کا معاملہ سامنے آتا تھا تو ان کا فیصلہ فولاد کی ایک دیوار کی طرح اٹل ہوتا تھا اور اس ضمن میں انہوں نے کبھی کسی عافیت کوشی یا موقعہ پرستی کے رجحان سے اپنی شخصیت کو داغ دار نہیں ہونے دیا۔ درآنحالیکہ اُن کے معاصرین کے ایک بہت بڑے طبقے نے اس سلسلے میں کردار کی انفعالیت اور کم زوری کا قدم قدم پر مظاہرہ کیا تھا۔ ہندوستان کی جنگِ آزادی نے اُن پر اتنے گہرے اثرات مرتسم کئے تھے کہ جب ایّام جوانی میں انہیں پولیس کی ایک اعلیٰ ملازمت کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے رات بھر جاگنے اور ایک شدید نفسیاتی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اگلی صبح انٹرویو کے لئے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کے بڑے بھائی نے جو خود پولیس میں ایک افسر اور بڑے ہی عالم فاضل شخص تھے، ان کے اس فیصلے کو بے حد سراہا تھا کیوں کہ مولانا کا مؤقف فقط یہ تھا کہ وہ انگریزی حکومت کے ساتھ خود کو منسلک کرنے سے معذور ہیں۔ بعدازاں جب دوسری جنگِ عظیم لڑی گئی اور ہمارے بہت سے ادبا انگریزی فوج کے بڑے بڑے عہدوں اور پھوٹوں کی خاطر بہت دور نکل گئے تو بھی مولانا نے غربت کی آزاد زندگی کو انگریز کی ملازمت کے غلامانہ فعل پر ترجیح دی اور اپنے خونِ جگر سے زبان اور ادب کی خدمت کرتے رہے۔ تقسیمِ ملک کے بعد جب ہمارے بہت سے ادیبوں نے اپنے ضمیروں کا سودا کیا تو بھی مولانا اپنے مسلک پر ڈٹے رہے۔ اُن کا دامن ہمیشہ پاک رہا اور یہی پاکیزگی اُن کی جراتِ اظہار کا اصل باعث ثابت ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے آخری دم تک آزادیٔ رائے کے لئے اپنی جنگ جاری رکھی اور اس ضمن میں عافیت کوشی کے کبھی مرتکب نہیں ہوئے۔

اپنے مسلک پر کاربند رہنے اور شہری آزادی کے تصور کو برقرار رکھنے کے سلسلے میں وہ کسی قسم کی مفاہمت یا سمجھوتے کے ہرگز قائل نہیں تھے۔ جن حضرات نے زبان و ادب نیز سیاسی اور تعلیمی مسائل کے بارے میں ان کے مضامین اور خطبات پڑھے یا سُنے ہیں۔ وہ ضرور میرے اس بیان کی تصدیق کریں گے۔ لیکن عام زندگی میں بھی مولانا نے کبھی ایک باشعور آزاد شہری کے منصب

کو ترک نہیں کیا۔ وہ ایک عام شہری کی آزادیٔ فکر و عمل کے داعی تھے اور ہر اس موقعہ پر سینہ سپر ہو جاتے تھے جب اس آزادی کو کوئی خطرہ درپیش ہوتا تھا۔ بہت سے احباب کو یاد ہوگا کہ جب موٹروں کے نمبر پلیٹ اردو میں لکھنے کا سوال پیدا ہوا تھا تو مولانا نے اس اصولی بات پر پولیس کے ایک بڑے افسر سے ٹکر لے لی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کا محض یہ اقدام نیم ادبی قسم کی ان تمام تحریکوں پر بھاری تھا جو عافیت کوشی کو مسلک بنا کر چھوٹی چھوٹی باتوں کو اچھالتی ہیں لیکن ایک نامعلوم خطرے کو محسوس کر کے اصولی باتوں پر فوراً سمجھوتہ کر لیتی ہیں۔ عام زندگی میں بھی مولانا اپنے مسلک پر ہمیشہ کاربند رہے۔ ایک بار ہم چیئرنگ کراس کی سمت سے 'ادبی دنیا' کی طرف فٹ پاتھ پر چلتے ہوئے آ رہے تھے کہ ایک جگہ مولانا اچانک رک گئے۔ یہاں کسی شاندار کار کے اگلے پہیوں نے آدھے سے زیادہ فٹ پاتھ پر قبضہ جما رکھا تھا۔ مولانا نے کار کے ڈرائیور سے کہا کہ فوراً اپنی کار فٹ پاتھ سے نیچے اتار لے۔ کار کسی بڑے آدمی کی تھی۔ اس لئے ڈرائیور نے مولانا کی بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ اتنے میں خود بڑے صاحب کسی دکان سے نکلے اور پھونک پھونک کے قدم رکھتے ہوئے کار کی طرف آ گئے۔ مولانا نے آگے بڑھ کر ان صاحب سے کہا: "اے عظیم الشان کار کے مالک! یہ ساری کشادہ سڑکیں تیری ملکیت ہیں تو بے شک ان پر اپنی کار برق رفتاری سے چلا لیکن یہ چار فٹ چوڑا فٹ پاتھ میرا اور مجھ ایسے ان لاکھوں افراد کا ہے جو اس ملک میں بستے ہیں۔ کیا تو یہ فٹ پاتھ بھی ہم سے ہتھیا لینا چاہتا ہے؟" مولانا کی بات سن کر وہ صاحب اس قدر خفیف ہوئے کہ انہوں نے فوراً اپنی کار فٹ پاتھ سے نیچے اتار لی اور دیکھتے دیکھتے ہوا ہو گئے۔

اردو زبان اور ادب کے مسئلہ پر بھی اُن کی ثابت قدمی کا یہی عالم تھا۔ انہیں اردو سے عشق تھا اور وہ اُسے قومی یک جہتی کی سب سے بڑی علامت قرار دیتے تھے۔ بعض دوسرے لوگوں کے برعکس جو ہوا کا رُخ دیکھ کر اپنے مسلک میں ضروری لچک پیدا کر لیتے ہیں، مولانا نے اپنے موقف کے سلسلے میں کبھی کسی کم زوری کا اظہار نہیں کیا۔ ادبی نظریات کے ضمن میں بھی ان کی رائے غیر متزلزل تھی وہ ادب کو کسی مقصد یا نقطۂ نظر کے تابع قرار دینے کے سخت مخالف تھے اور محض اس بنا پر انہوں نے ترقی پسند تحریک کی مخالفت کی تھی۔ اس سے ترقی پسند حلقے میں یہ غلط فہمی عام ہو گئی تھی کہ مولانا شاید بورژوا تحریک کے حامی ہیں۔ اصل بات یہ تھی کہ مولانا خود مساوات اور انسان دوستی

کے مبلغ تھے اور انہوں نے ساری عمر جسم و جان کے رشتے کو برقرار رکھنے کے لئے ایک شدید تگ ودَو کی تھی لیکن وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ ادب ذات کا اظہار ہے، کسی نظریئے کی تبلیغ کا آلہ نہیں۔ اسے سرمایہ داری کی مخالفت میں استعمال کیجئے یا اس کی حمایت میں خود ادب کو اس سے سخت صدمہ پہنچے گا۔ وہ ادب کی تخلیق کے ضمن میں "ایسا ہونا چاہیئے" کے قائل نہیں تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ یوں ادبی تخلیق کی خود روانی مجروح ہو جاتی ہے۔ گلٹڈ کے سلسلے میں بھی مولانا کا موقف صاف اور توانا تھا اور اس سوال پر بھی وہ سمجھوتہ کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھے۔ کردار کی یہ توانائی اور ارادے کا یہ ثبات مولانا کی شخصیت کا ایک اہم جزو تھا۔

بہت ہی کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ مولانا کو مہاتما بدھ سے ایک خاص عقیدت تھی۔ وہ اسے ہندوستان کا "مردِ عظیم" سمجھتے تھے۔ غالباً اس عقیدت کا باعث یہ تھا کہ خود مولانا کی ذات کے آئینے میں بدھ مت کی روح کا عکس موجود تھا۔ مثلاً مولانا نے بدھ کے ایک بلند اخلاقی معیار کو ادب کے علاوہ زندگی کے معاملات میں بھی ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ پھر مہاتما بدھ کی طرح مولانا نے بھی ایک اونچے مقصد کے حصول اور ایک عظیم خواب کی تکمیل کے لئے اپنا تن من اور دھن قربان کیا اور یوں "عرفان" کے اُن مدارج تک جا پہنچے جن تک عام لوگ شاذ ہی کبھی پہنچتے ہیں۔ مولانا تنگ مذہبی نظریات سے کس قدر بلند و بالا تھے اور خدا اور کائنات کے بارے میں اُن کے نظریات میں کشادہ دلی کا عُنصر کس قدر توانا تھا، یہ ایک الگ داستان ہے، اور ایک الگ مضمون کی طالب!

مگر اُس چمکتی دوپہر میں ہوٹل میں کھانا کھاتے ہوئے مولانا نے نہ تو گزرے ہوئے ایام کو واپس بلانے کی کوشش کی اور نہ مستقبل کے خوابوں کی چکا چوند سے روشنی کشید کی۔ اس روز شاید پہلی بار وہ کلیتاً حال کے لمحے پر رُک گئے تھے اور ایک غیبی آواز کو سُننے کے بعد اپنا بوریا بستر سمیٹنے لگے تھے۔ مولانا سے یہ میری آخری ملاقات تھی!

راجہ مہدی سے میری پہلی اور آخری ملاقات

میں نے جب ادب کی دنیا میں قدم رکھا تو راجہ مہدی لاہور سے جا چکے تھے۔ پہلے سنا کہ وہ دلی کی گلیوں میں خاک چھان رہے ہیں۔ پھر خبر آئی کہ بمبئی نے انہیں نگل لیا ہے۔ یہ نہیں کہ اُن دنوں میں بطورِ خاص ان سے ملاقات کا خواہاں تھا اور اس لئے ان کی نقل و حرکت سے باخبر رہتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنے محبوب لکھنے والوں سے مل کر میں اس خوابناک کیفیت کو ختم کرنا نہیں چاہتا تھا جو ان کی نگارشات کے مطالعہ سے میرے گرد دُور دُور تک پھیل گئی تھی۔ اس وقت میرا یہ خیال تھا کہ داستان کا شہزادہ داستان کے چمن زار کے اندر ہی اچھا لگتا ہے۔ اگر وہ بنفسِ نفیس سامنے آجائے تو پھر شاید اس کی ذات سے وابستہ سارے خواب ہی چکنا چُور ہو جائیں۔ ایک طویل عرصہ تک یہ خیال مجھ پر مسلط رہا اور میں ادبی طور پر سرگرم رہنے کے باوجود ادبا اور ان کے ادبی اکھاڑوں سے دُور دُور ہی رہا۔ پھر جب تقدیر نے مجھے اس کارزار میں لا پھینکا اور میں ادباء سے شخصی سطح پر متعارف ہوا تو میرا یہ عمومی تاثر کچھ اور بھی گہرا ہو گیا۔ تاہم اس عرصہ میں مجھے دو ایسے ادیبوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جن کی درخشاں شخصیتوں نے مجھے اپنے موقف پر نظر ثانی کے لئے مجبور کر دیا۔ اور میں سوچنے لگا کہ اگر کوشش صادق ہو تو جوئندہ یابندہ کے بصداق کبھی کبھی اس جہانِ بے ثمر میں میٹھا پھل بھی مل سکتا ہے۔ یہ دو شخصیتیں تھیں۔ مولانا صلاح الدین احمد اور راجہ مہدی علی خان! دونوں اب اس دنیا میں نہیں مگر ان کی یادیں میرے ساتھ ساتھ رواں ہیں اور جب کبھی تاریکی یلغار کرتی ہے تو وہ دبے پاؤں میرے نہاں خانۂ دل میں داخل ہو کر ہر طرف چراغاں کر دیتی ہیں۔

میں راجہ مہدی کی نظموں سے کب متعارف ہوا، یہ بات مجھے معلوم نہیں۔ البتہ اس قدر

مجھے یاد ہے کہ میں جب ۱۹۴۹ء میں باقاعدگی سے لکھنے لگا تو مجھے راجہ صاحب کی بیشتر نظمیں ازبر تھیں۔ ایک تو مجھے ان کے ہاں مزاح کی کھلی کھلی کیفیت پسند تھی جس میں حقارت، درشتی یا کمینگی کا نام و نشان تک نہ تھا بلکہ مخاطب کے ساتھ ہمدردانہ انداز میں "کھیلنے" یا یوں کہہ لیجئے کہ لطف لے کر اسے چھیڑنے" اور پھر خود" چھڑ جانے" کی کیفیت نمایاں تھی۔ یہی حال ان کے اسلوب کا تھا کہ اس میں تازگی تو بلا کی تھی لیکن اس پر آرائشی انداز کی کوئی چھاپ ثبت نہیں تھی۔ تضمین اور تصرف کو وہ ضرور بروئے کار لاتے تھے لیکن ایک عجیب سی نفاست کے ساتھ! مجھے راجہ مہدی کے ہاں دوسری بات یہ پسند تھی کہ ان کا مشاہدہ تیز بھی تھا اور سچا بھی! حقیقت یہ ہے کہ اگر وہ نظمیں نہ لکھتے تو افسانے کے میدان میں ایک نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرتے۔ ان کی نظموں میں مشاہدہ کا عنصر اس لئے بھی کار آمد تھا کہ وہ اس کی مدد سے کردار نگاری کے نہایت عمدہ نمونے پیش کرنے پر قادر تھے۔ مگر مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ایسا کرتے ہوئے کردار کے مضحک روپ کو بھی پیش کر دیتے تھے۔ چنانچہ قاری بیک وقت ان کی کردار نگاری سے بھی متاثر ہوتا تھا اور مزاح نگاری سے بھی اور یہ بات مجھے بہت کم دوسرے مزاح نگاروں کے ہاں دکھائی دی ہے۔ مثلاً اُن دنوں مجھے راجہ جی کی یہ نظم بہت پسند تھی جسے میں آج بھی اپنی یادداشت سے نقل کر سکتا ہوں:

لے کے بیڑی کا ایک لمبا کش
ایک چابک لگا کے گھوڑے کو
تانگے والا مرا ــــ لگا کہنے
پچھلے سرما کی صبح کا ہے ذکر
میں نے شادی کی مشہدی لنگی
آنکھ پر کچھ جھکا کے باندھی تھی
میری اک اک نگہ شکاری تھی
اس سڑک پہ مری جو شامت آئے
میں نے کالج کی اک حسینہ سے
بات آہستہ سے کوئی کہہ دی
آؤ دیکھا نہ اُس نے کچھ تاؤ
اپنے گورے سے عطر آلودہ
ہاتھ سے زور کا تھپڑ
میرے منہ پر جما دیا اُس نے
اور کیا چاہیئے تھا بابو جی؟

اس نظم میں ایک اوباش سے کردار کو جس فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے وہ ایک بہت

اچھے افسانہ نگار کے لئے بھی باعثِ فخر ہو سکتا ہے۔ بیڑی کا کش لے کر گھوڑے کو چابک لگانا مشہدی لنگی کو آنکھ پر جھکا کر باندھنا۔ کالج کی حسینہ سے سرگوشی میں کوئی بات کرنا اور پھر شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی کی داستان کہ طمانچہ اس کے لئے ایک شیریں انعام بن گیا۔ یہ سب مشاہدات بیک وقت سچے بھی ہیں اور مضحکہ خیز بھی ریچ ہونے کے باعث ان کو یوں بھی پیش کیا جا سکتا تھا کہ ہنسی کو تحریک تک نہ ملتی۔ مگر راجہ مہدی کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے سچی کردار نگاری سے مضحک کیفیت کشید کرلی۔ بس مجھے راجہ مہدی کی یہ خاص ادا بہت پسند تھی اور اسی لئے مجھے ان کی بیشتر نظمیں ازبر ہوگئی تھیں۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے انہیں ایام میں ایک روز مولانا صلاح الدین احمد کو راجہ صاحب کی نظم "ایک جہلم پر" سنائی اور اب میرے سامنے مولانا کی تصویر ابھر آئی ہے کہ وہ نظم کے ایک ایک شعر پر اس قدر ہنسے تھے کہ آنسو ان کی آنکھوں کے گوشوں سے نکل کر بار بار ٹھوڑی تک آجاتے تھے اور وہ اپنے اس رومال سے جس کے ایک کونے سے چابیوں کا گچھا مستقلاً بندھا رہتا تھا، ان آنسوؤں کو پونچھتے بھی جاتے ہیں — میرا نظم سنانا، مولانا کے قہقہے، آنسوؤں کی رم جھم اور چابیوں کے گچھے کی جھنکار، یہ سب باتیں مل جل کر ایک ایسی سہانی کیفیت میں تبدیل ہوگئی تھیں کہ میں اس کے تصور ہی سے قندِ مکرّر کا لطف لے سکتا ہوں۔ مگر اس کیفیت کو وجود میں لانے والی ہستی اس وقت بھی سینکڑوں کوس دور بمبئی شہر کے کسی گمنام گوشے میں منقار زیرِ پر تھی اور اردو ادب کے ایوان میں اب دوسرے مزاح نگاروں اور طنز نگاروں کا طوطی بول رہا تھا۔ یہ بات ہم لوگوں کو منظور نہیں تھی۔ چنانچہ اس واقعہ کے کافی عرصے بعد جب مولانا نے "ادبی دنیا" کے آخری اہم دور کی ابتدا کی تو میں نے سب سے پہلے راجہ مہدی کو گمنامی کی دنیا سے باہر نکلنے پر آمادہ کرنا ضروری سمجھا۔ سو میں نے انہیں ایک طویل خط لکھا اور بتایا کہ وہ بن باس جو انہوں نے اپنے لئے پسند کر رکھا تھا، ان کے لاتعداد مداحین کو قطعاً ناپسند تھا۔ پہلے تو راجہ صاحب نے سمجھا کہ میں انہیں محض "بنا" رہا ہوں۔ پھر انہیں شک گزرا کہ یہ محض ایک مدیرانہ TRICK ہے لیکن جب میں نے انہیں "اردو ادب میں طنز و مزاح" بھجوائی جس میں راجہ صاحب کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف ہے تو برف کے اس پہاڑ میں ہلکی سی جنبش ہوئی۔ آفتاب کی شعاعیں تیز تھیں اور دھند چھٹ رہی تھی۔ چنانچہ برف کے پہاڑ نے پگھلنا شروع کیا اور دیکھتے دیکھتے اس کے قدموں سے کئی البیلی ندیاں

پھوٹ نکلیں۔ اور پھر ایک عظیم الشان دھارے کی صورت میں بہنے لگیں۔ ادبی دنیا نے اپنی سکت کے مطابق اپنے ظرف کو آگے بڑھادیا لیکن اس دھارے کے لئے محض ایک برتن کافی نہیں تھا چنانچہ وہ چھلک گیا اور پھر ہندوستان اور پاکستان کے تمام رسائل مل کر بھی اس کو سمیٹنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

راجہ صاحب سے میری ملاقات پہلے نظموں کے ذریعے تھی۔ اب خطوں کے ذریعے بھی ہونے لگی مگر "اصلی ملاقات" ابھی دور تھی۔ ادھر راجہ صاحب کی طرف سے تقاضا شدید سے شدید تر ہوتا جارہا تھا کہ ملاقات کی کوئی صورت نکالنی چاہیئے۔ ملاقات کی صورت نکالنے کے لئے انہوں نے مجھ پر خطوں کی بوچھار کردی۔ —— چنانچہ بعض اوقات تو مجھے ایک وقت کی ڈاک سے راجہ صاحب کے تین تین چار چار خط موصول ہو جاتے تھے۔ ان خطوں میں لفافے بھی ہوتے تھے۔ کارڈ بھی۔ بعض بیرنگ ہوتے اور بعض پر ضرورت سے زیادہ ٹکٹ چسپاں ہوتے۔ مگر یہ سب ان کے نام کی رنگ برنگی مہروں سے مزین ہوتے۔ یوں لگتا جیسے وہ دن بھر مجھے ہی خط لکھتے رہتے ہیں اور اس بات کی پرواہ بھی نہیں کہ انہیں ٹکٹ والے لفافے میں بھیجیں یا بے ٹکٹ لفافے میں۔ دوسری طرف میرا اپنا بھی حال بُرا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اُڑ کر جاؤں اور اس قدر ٹوٹ کر پیار کرنے والے انسان کو خاکی جسم سے جھانکتے ہوئے بھی دیکھوں۔ ادھر راجہ صاحب کی صحت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ہاں جب برف پگھلنے کا موسم آیا تو ان کی ذات میں چھپے ہوئے انسان نے محبت، مزاح اور علالت — تینوں میں بیک وقت اپنا اظہار کرنا ضروری سمجھا ان کی محبت محض ایک شخص کے لئے نہیں تھی، گو مجھے اس بات کا فخر ہے کہ اس میں سے وافر حصہ مجھی کو نصیب ہوا۔ وہ اپنی منہ بولی بیٹیوں سے بھی ٹوٹ کر پیار کر رہے تھے اور اپنی بیگم طاہرہ سے بھی اس فرق کے ساتھ کہ وہ بیٹیوں سے کم اور بیگم سے زیادہ لڑتے تھے (اور لڑائی ان کے اظہارِ محبت کا ایک البیلا زاویہ تھا) محبت کی طرح ان کا مزاح بھی محض ایک شخص یا طبقے کے لئے نہیں تھا۔ اس کا دائرۂ کار انسان کی متعقل نوعیت کی ناہمواریوں تک پھیلا ہوا تھا اور اسی لئے تمام طبقات اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے البتہ انہوں نے علالت کے سلسلے میں کسی فیاضی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور اس پر بلا شرکت غیرے قابض ہوگئے تھے۔ یہ ان کی اپنی مملکت تھی جس کے وہ بے تاج راجہ تھے اور اس کے کرب سے بھی وہ اکیلے ہی

گزرے۔ ہنستے مسکراتے، روتے چیختے، باتیں کرتے اور باتیں بناتے رہ اپنے جسم کے پگھلتے ہوئے گلیشیئر کو دیکھتے ہی چلے گئے۔ تاآنکہ ایک روز گلیشیئر آہستگی کے ساتھ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ پھر پوری طرح پگھل کر خاک میں جذب ہوگیا۔

۱۹۶۳ء میں مجھے بمبئی کا ویزا ملا اور میں بیوی بچوں کو ساتھ لئے، گلے سے بچھڑی بھیڑوں کی تلاش میں روانہ ہوگیا۔ راستے کی طویل داستان میرے سفرنامہ کا موضوع ہے۔ البتہ یہاں مجھے اس کا وہ حصہ دوبارہ پیش کرنا ہے جس میں راجہ صاحب سے میری پہلی ملاقات کا حال درج ہے۔

"بمبئی سنٹرل کے اسٹیشن پر ہم سب کی نظریں راجہ مہدی علی خان کو ڈھونڈ رہی تھیں نہ اس سے پہلے کبھی راجہ صاحب نے ہمیں دیکھا تھا اور نہ ہم نے راجہ جی کو! لیکن ان کی تصاویر نے ہمیں ان سے کافی حد تک متعارف کرا دیا تھا۔ مینا اور سلیم نے استفسار کیا کہ ہم راجہ جی کو کیسے پہچانیں گے۔ میں نے جواباً کہا کہ پلیٹ فارم پر تمہیں جو سب سے موٹا شخص بے اختیار ہنستا ہوا نظر آئے وہی راجہ مہدی علی خان ہوگا۔ اتفاق دیکھئے کہ پلیٹ فارم پر پھرتے ہوئے کالے کلوٹے پنجر نما انسانوں میں ہمیں ایک ہنستا ہوا "ابوالہول" بالکل الگ تھلگ کھڑا ہوا نظر آیا اور قطعاً غیر شعوری طور پر ہم سب کی انگلیاں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ راجہ صاحب نے بھی ہمیں پہچان لیا۔ لیکن انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ اپنے ساتھ دوستوں کی ایک پوری فوج لائے تھے۔ پھر قلیوں سے لے کر ٹیکسی ڈرائیوروں تک کو انہوں نے پہلے ہی سے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا وہ روایتی گل محمد کی طرح اپنی جگہ پر کھڑے پان چباتے اور ہنستے رہے۔ وہیں سے ہاتھ ہلا ہلا کر قلیوں کو ہدایات براڈکاسٹ کرتے اور انڈین ریلوے پر سنسکرت آمیز رنڈیاپائی زبان میں لعنتیں بھیجتے رہے۔ کھڑے ہی کھڑے انہوں نے مجھے کھینچ کر خود سے لپٹا لیا، کھڑے ہی کھڑے مینا اور سلیم کے سروں پہ ہاتھ پھیرا اور پھر کہرام برپا کرنے میں مصروف ہوگئے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر ہمارا سامان ریڑھیوں پہ لاد دیا گیا تھا اور قافلہ باہر کی طرف کوچ کر رہا تھا۔ اب راجہ صاحب نے پہلی بار خود کو جنبش دی اور گیٹ کی طرف قدم بڑھائے۔ میں نے پلٹ کر اس "مقدس" مقام کا جائزہ لیا جہاں راجہ صاحب

پچھلے ایک گھنٹے سے کھڑے تھے۔ وہاں اب پان کی سرخ پیکوں سے ایک اچھا خاصا جوہڑ وجود میں آگیا تھا اور چند سہمے ہوئے مسافر اسے غور غور سے تک رہے تھے۔"

مگر پلیٹ فارم کی یہ ملاقات تو سرسری سی تھی۔ اصل ملاقات تو ان کی رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد شروع ہوئی جو اپورے دس روز نان اسٹاپ جاری رہی۔

راجہ صاحب سے مل کر مسرت کی جس لہر نے میرے رگ وپے میں ایک عجیب میٹھی سی راحت سمودی، اسے بیان کرنا بے حد مشکل ہے۔ بس یہ محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی لطیف شے راجہ جی کے ہر بُن مو سے نکل کر فضا کو معطر کر رہی ہے۔ ایسا بے ریا خلوص اور پیار کی ایسی تھپک کر سلا دینے والی گرمی بہت کم لوگوں کے ہاں دکھائی دی ہے مگر لطف کی بات یہ ہے کہ اپنی دلی کیفیات کے اظہار کے لئے انہوں نے ابتداً لفظوں سے مدد نہیں لی ان کے سراپا میں جو ہلچل پیدا ہوئی وہ ان کی حرکات و سکنات سے نیز ان کی آنکھوں کی پتلیوں کے ذریعے اپنا اظہار کرتی رہی اور اس اظہار میں کوئی ایسی بات تھی جس پر لفظوں کے ہزاروں چمکتے ہوئے پیکروں کو بخوشی قربان کیا جا سکتا ہے۔ پھر وہ آہستہ آہستہ لفظوں کے دیار میں آتے چلے گئے اور جلد ہی مجھے محسوس ہوا کہ ان کی گفتگو میں بچوں کی سی معصومیت اور تازگی ہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ یہ معصومیت تو میری دیکھی بھالی ہے اور میں اسے راجہ صاحب کے کلام میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔ اس معصومیت کو انور سدید نے بجا طور پر "کھلنڈرا پن" کا نام دیا ہے۔ ثبوت اس کا مجھے یوں ملا کہ راجہ صاحب نے ملاقات کے "پہلے شاک" کو برداشت کرنے کے فوراً بعد سلیم کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ اس وقت سلیم کی عمر یہی کوئی چھ سات برس ہوگی اور راجہ صاحب پچاس سے تجاوز کر چکے تھے مگر دونوں ہم عمر دکھائی دے رہے تھے۔ بمبئی میں ایک طویل عرصہ کے قیام کے بعد راجہ صاحب اب اردو کے سوا اور کسی زبان میں بات نہیں کرتے تھے اور اسٹیشن سے گھر تک انہوں نے جو چند کٹے پھٹے جملے کہے وہ بھی اسی زبان میں تھے اور اب وہ سلیم سے بھی اپنی اسی منہ بولی زبان میں گفتگو کرتے ہوئے اُسے بتا رہے تھے کہ کس طرح انہوں نے بچپن میں ایک کنکر مار کر مرغابی کی ٹانگ توڑ دی تھی۔ یہ گویا ایک طرح کا چیلنج تھا جس کے جواب میں سلیم نے چھوٹے

ہوئے سانس کے ساتھ اردو ہی میں کہا۔" چاچا جان! میری گلیلی گھگی کی دھون بھن سکتی ہے۔"
(چچا جان میری غلیل فاختہ کی گردن توڑ سکتی ہے) یہ فقرہ سن کر راجہ صاحب خوب ہنسے۔ اس کے
بعد ہم جتنا عرصہ بمبئی میں رہے وہ ہم سے اردو لیکن سلیم سے پنجابی ہی میں گفتگو کرتے رہے۔

راجہ مہدی با آواز بلند گفتگو کرتے تھے۔ وہ جب باتیں کرنے بیٹھتے تو گھر کی سب آوازیں ان
کی آواز کے نیچے دب جاتیں۔ پھر جب وہ لحظہ بھر کے لئے رکتے تو بلیوں کی میاؤں (راجہ صاحب
نے اپنے گھر میں بہت سی بلیاں پال رکھی تھیں)، کانشی ناتھ کے برتنوں کی جھنکار (کانشی ناتھ ان کا
باورچی تھا)، مینا کی کھانسی اور خواتین کی سرگوشیوں سے مرتب شدہ ایک گہرا سناٹا اپنے وجود کا احساس
دلاتا۔ خود راجہ صاحب قطعاً گول مٹول تھے۔ کمرے کے عین درمیان انہوں نے ایک گول سی کرسی
بچھا رکھی تھی جو راکنگ چیئر بھی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ بالکل ایک فٹ بال کی طرح نظر آتے بلکہ کئی بار
مجھے یہ محسوس ہوا کہ الفرڈ ہچ کاک ہندوستانی لباس میں نمودار ہو گئے ہیں۔ راکنگ چیئر ایک طرح سے
راجہ صاحب کے مختلف موڈز کا بیرومیٹر بھی تھی اور ان کے ملاقاتی راکنگ چیئر کی رفتار سے راجہ صاحب
کے درجۂ حرارت کا بھی باآسانی اندازہ کر لیتے تھے۔ مثلاً اگر کسی کے آنے پر کرسی لرزہ براندام ہو جاتی
تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ راجہ صاحب کو ان کے آنے سے خوشی ہوئی ہے اور اب وہ
سامنے بچھے ہوئے صوفے پر بخوشی بیٹھ سکتا ہے اور اگر کسی کا درشن پاتے ہی کرسی ایک جھٹکے
کے ساتھ رک جاتی اور راجہ صاحب کانشی ناتھ کو اس کے سلسلۂ نسب کے بعض نازک مقامات
سے آگاہ کرنے لگتے تو ملاقاتی جان لیتا کہ مطلع صاف نہیں ہے اور پھر وہ طوفان کے آنے
سے پہلے ہی ان کے سامنے سے ہٹ جاتا۔

بلیوں اور کانشی ناتھ کے علاوہ راجہ صاحب کے ہاں تیسری شے ایک پراسرار سی الماری
تھی جسے انہوں نے مقفل کر رکھا تھا۔ جب کبھی ضرورت پڑتی تو وہ اس الماری کا پٹ بس اتنا
کھولتے کہ ان کا سر اندر چلا جاتا۔ چند منٹ تک الماری کے اندر کھسر پھسر سی ہوتی جیسے چوہے
آپس میں لڑ رہے ہیں اور پھر سر باہر آجاتا، الماری کا پٹ کھٹ سے بند ہو جاتا اور تالا اس
پر اپنی مہر ثبت کر دیتا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ راجہ صاحب شاید ہم سب سے آنکھ بچا کر
پیٹیز یا پکوڑے وغیرہ کھاتے ہیں۔ پھر ایک روز اس کارروائی کے دوران ایک پھٹا ہوا مسودہ

الماری میں سے سرک کر فرش پر گر پڑا اور میں نے جلدی سے اٹھالیا۔ راجہ صاحب نے وحشت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا مگر پھر مسکرا کر خاموش ہو گئے۔ میں نے لطف لے کر سوچا کہ شاید یہ معطر خطوط پر مشتمل راجہ صاحب کی داستانِ محبت ہو گی۔ لیکن وہ تو نجومی کا زائچہ نکلا۔ تب پتہ کھلا کہ ساری الماری نجومیوں کی کارستانیوں سے اٹی پڑی ہے۔ کچھ دیر بعد راجہ صاحب نے راکنگ چیئر میں جھولتے ہوئے مجھے بتایا کہ دراصل بمبئی شہر ایک بہت بڑا قمار خانہ ہے۔ کسی کو پتہ نہیں کہ اگلی صبح کیا ہو گا۔ کیا آنے والے اوقات میں قسمت کی دیوی اسے خندہ پیشانی سے ملے گی یا اس سے منہ موڑ لے گی۔ منہ موڑ لینے کی صورت میں اتنے بڑے عفریت نما ظالم شہر میں فاقہ مستی اور ذلت و رسوائی کی زندگی بسر کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایک طویل عرصہ اس قمار خانے میں قیام پذیر رہنے کے بعد اب راجہ جی بھی تقدیر کے عمل دخل کے قائل ہو گئے تھے اور اس لئے انہوں نے تقدیر پر وہ سارا لٹریچر خرید لیا تھا جو بمبئی کے فٹ پاتھوں پر بطور BEST — SELLER فروخت ہوتا ہے۔ بعد ازاں میں نے سوچا کہ یہ محض بمبئی ایسے قمار خانے میں رہنے کا نتیجہ نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ راجہ صاحب نے بچپن سے جوانی اور جوانی سے ادھیڑ عمر تک قسمت کے مد و جزر پر ہی زندگی بسر کی تھی اور یہ زندگی گاہے کانٹوں کا بستر اور گاہے پھولوں کی سیج بن جاتی تھی۔ چنانچہ اب انہوں نے خود کو ایک بے پتوار کشتی کی طرح سمندر کی موجوں کے حوالے کر دیا تھا۔ البتہ وہ آنے والے طوفان کے بارے میں تقدیر کے موسمی دفتر کو CONSULT ضرور کرتے رہتے تھے تا کہ ہر نئی صورتِ حال کے لئے خود کو ذہنی طور پر تیار کر سکیں۔

راجہ مہدی کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ چنانچہ ان کے گھر کے صحن میں فلک شگاف قہقہوں کی گونج تو سنائی دیتی تھی، توتلی باتوں کی چہکار بالکل نہیں تھی۔ خود راجہ صاحب کو اس خلا کا بڑی شدت سے احساس تھا گو انہوں نے اس کا اظہار کبھی نہیں کیا۔ مگر قطعاً غیر ارادی طور پر انہوں نے اس خلا کو پُر کرنے کے لئے تین اہم اقدامات کئے۔ پہلا یہ کہ انہوں نے گھر میں کچھ ننھی منی پیاری پیاری بلیاں پال لیں۔ لوگ ایسے خلا کو پُر کرنے کے لئے طوطے اور کتے بھی پالتے ہیں مگر بلیوں کی حرکات و سکنات بچوں کے اضطراری اعمال سے زیادہ مشابہ ہیں تاہم میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوں کہ خود راجہ صاحب بلیوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ ممکن ہے مہمانوں کے سامنے اپنی اس "کمزوری" کا

اعلان کرنا نہ چاہتے ہوں۔ ممکن ہے کوئی اور وجہ ہو۔ البتہ پاکستان میں انہوں نے اپنے لئے دو بیٹیاں دریافت کرلی تھیں جنہیں وہ بڑے اہتمام کے ساتھ ہر روز بلاناغہ خط لکھتے تھے مگر سوال یہ ہے کہ انہوں نے بیٹیاں پاکستان ہی میں کیوں بنائیں۔ وہاں بمبئی میں یہ کارروائی کیوں نہ کی؛ سوچتا ہوں تو اس کی وجہ مجھے یہ دکھائی دیتی ہے کہ وہ پاکستان کے لئے اداس تھے۔ انہیں اپنی جنم بھومی سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ وہ اس لگاؤ کا کھلے بندوں اظہار شاید نہیں کرسکتے تھے اس لئے انہوں نے اپنی جنم بھومی سے ایک بالکل نیا رشتہ استوار کرلیا۔ باپ اور بیٹی کا رشتہ! تقدس اور طہارت کا رشتہ! ایک ایسا رشتہ جو انسانیت کی معراج ہے — خلا کو پُر کرنے کے لئے راجہ جی نے تیسرا قدم یہ اٹھایا کہ بچوں کے لئے لاتعداد ہلکی پھلکی، ناچتی کودتی نظمیں لکھیں۔ کہنے کو تو یہ نظمیں بچوں کی پوری فوجِ ظفر موج کے لئے تھیں، لیکن میرا اندازہ ہے کہ انہوں نے یہ نظمیں اُن بچوں کے لئے لکھیں جو ان کے خوابوں کے باسی تھے۔ جو اُن کے نہاں خانۂ دل میں مقیم تھے لیکن جنہوں نے وجود کی زنجیروں کو زیبِ جاں کرنا کبھی گوارا نہ کیا مگر راجہ صاحب نے محض بچوں کے لئے ہی نظمیں نہ کہیں بلکہ انسان کے بطون میں چھپے ہوئے سدا بہار بچپن کو بھی مخاطب کیا۔ اس بچپن کے مضحک پہلوؤں کو اجاگر کرنے میں راجہ صاحب نے جو خوبصورت پیرایہ اختیار کیا وہی ان کے فن کا حاصل ہے مگر یہ ان کے ذہنی اور روحانی خلا کو پُر کرنے کی ایک کاوش بھی تھی۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو راجہ صاحب کا مزاحیہ کلام دوسروں کو خوش کرنے یا شہرت حاصل کرنے کے لئے نہیں تھا بلکہ اپنی ذات میں چھپے ہوئے بچوں اور انسان کی ذات میں مستور بچپن کو مخاطب کرنے، اس کے ساتھ کھیلنے اور شرارتیں کرنے کے لئے تھا۔ اپنی اس شریر کارروائی میں انہوں نے جو کامیابی حاصل کی ہم سب کے سامنے ہے

آج میں دس برس کی طویل مدت کے بعد راجہ صاحب سے اپنی اس پہلی اور آخری دس روزہ ملاقات کا حال لکھ رہا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو محض ایک لمحہ تھا جو بمبئی سنٹرل کے طویل و عریض پلیٹ فارم سے ایک قہقہہ بن کر ابھرا اور پھر اسی پلیٹ فارم پر اپنی صدائے بازگشت میں گم ہوکر رہ گیا۔ درمیان میں راجہ جی نے ہمیں بمبئی کے گوشے گوشے کی جو سیر کرائی۔ دوستوں سے ملایا فلمیں دکھائیں، ہماری ایک ایک بات کا خیال رکھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فضا کو زعفران زار میں تبدیل کئے رکھا۔ یہ سب کچھ اس قہقہے ہی کا ایک حصہ تھا۔ وقت بیت گیا۔ دس راتیں اور دس دن

ایک دوسرے کا تعاقب کرتے کرتے ہار گئے۔ مجھے یاد نہیں کہ اس قیام کے دوران میں دن اور رات میں کوئی فرق باقی بھی رہ گیا تھا یا نہیں۔ کیونکہ راجہ مہدی کی باغ و بہار شخصیت نے تمام امتیازات کو ختم کردیا تھا اور ہم پر ایک۔ ایسی سہانی کیفیت انڈیل دی تھی جس کے پڑول ایسے لمس کو میں آج بھی اپنے چہرے پر محسوس کر سکتا ہوں۔ راجہ صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں مگر میں جب بھی لحظہ بھر کے لئے اپنی آنکھیں بند کرتا ہوں تو اندھیرے کی سکرین پہ ان کا ہنستا ہوا چہرہ طلوع ہو جاتا ہے۔ وہی چہرہ جو اس شام بمبئی سنٹرل کے اسٹیشن پر میری آنکھوں کے سامنے ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا تھا۔

کوہِ ندا کا مُسافر

پھر یُوں ہوا کہ ایک روز کوہِ ندا سے حمید احمد خاں کا نام پکارا گیا۔ وہ اُٹھے اور اس منحوس آواز کی ڈور سے بندھے ہوئے زندگی کے زرد پہاڑ کو عبور کر گئے۔ مگر جس مقام پر وہ پچھلے ستر برس سے کھڑے رہے تھے وہاں اب بھی روشنی کا ایک ہالہ سا موجود ہے۔ میں جب ان کے رخصت ہونے کی خبر سن کر اس ہالے میں داخل ہوا تو یادیں شہد کی مکھیوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑیں۔ یہی یادوں کی ریت بھی ہے کہ ان کے ہونٹوں پر شہد مگر پہلو میں نیش سدا موجود رہتا ہے۔ وہ حلاوت اور شیرینی بھی مہیا کرتی ہیں اور خلش بھی۔ یا شاید اصل بات یہ ہے کہ اس خلش ہی میں شیرینی موجود ہوتی ہے۔

یادوں کا یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ میں سادہ ورق پر صرف چند ایسے نقوش ہی ابھاروں گا جن کا میری اپنی ادبی زندگی سے تعلق ہے۔ میں جب ۱۹۵۰ء میں حمید احمد خاں صاحب سے متعارف ہوا تو پہلا تاثر میں نے یہ قبول کیا کہ وہ ادب ہی نہیں زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی انتہائی مستعد ہیں۔ عام زندگی میں انسان بعض معاملات میں ایک حد تک مستعد ضرور ہوتا ہے لیکن دیگر بے شمار معاملات کو محض چھُو کر گزر جاتا ہے۔ خاں صاحب کے ہاں میں نے یہ بات دیکھی کہ وہ "چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ" کے قائل نہیں تھے بلکہ جب ایک بار کسی سے ہم قدم ہو کر چلتے تھے تو یہ عمر بھر کا ساتھ ہوتا تھا۔

اس طرح جب وہ ایک بار کسی کام کا بیڑہ اٹھا لیتے تو پھر ہر قسم کے آندھی طوفان کو نظر انداز کر کے اسے پوری سنجیدگی اور عزم کے ساتھ سرانجام دیتے۔ میری بے دلی آرزو تھی کہ

وہ میرے پی۔ایچ۔ڈی کے اس تھیسس کا دیباچہ لکھیں جو ان دنوں کتابی صورت میں شائع ہونے والا تھا۔ انہوں نے حامی بھر لی مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ مسودہ پڑھنے اور اس کے بارے میں مجھ سے تبادلہ خیال کرنے کے بعد ہی اس پر کچھ لکھ سکیں گے۔ کئی ہفتے یہ تھیس ان کے زیرِ مطالعہ رہا۔ پھر وہ چند روز کے لئے میرے پاس سرگودھا کے ایک دور افتادہ گاؤں میں پہنچے اور وہاں نہر کے کنارے سیر کرتے، کھیتوں میں گھومتے، درختوں کے نیچے سے گزرتے ہوئے انہوں نے اس کتاب کے تمام ابواب کا جائزہ لے ڈالا اور ساتھ ہی ساتھ مجھ پر سوالات کی بوچھار بھی کرتے رہے۔ ان کی اس "کارروائی" کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں تو اس موضوع کی پایاب لہروں ہی میں ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ درجنوں پہلو ایسے بھی تھے جن پر نئے نئے زاویوں سے روشنی ڈالی جا سکتی تھی۔ لاہور واپس آ کر انہوں نے میری اس کتاب کے لئے ایک نہایت خوبصورت دیباچہ تحریر کیا اور موضوع کے بہت سے امکانات سے مجھے آگاہ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر خان صاحب اس کتاب کا دیباچہ نہ لکھتے اور مجھے موضوع کے جملہ امکانات کو گرفت میں لینے کا درس نہ دیتے تو تحقیق کی طرف میرا اپنا رویہ یک طرفہ اور ادھورا ہی رہتا۔

خان صاحب کے ہاں یہ عجیب سی بات دیکھی کہ اپنے موضوع کے سلسلے میں تو وہ زیادہ سے زیادہ معلومات اور حقائق جمع کرنے کے عمل کو ایک ادبی مشن قرار دیتے تھے مگر کچھ لکھتے ہوئے، مترادف الفاظ، آرائشی تراکیب اور غیر ضروری جملوں کو اپنی تحریر سے خارج بھی کرتے جاتے تھے۔ کفایتِ لفظی کے اس رجحان نے ان کے اسلوب میں ایک عجیب سی چاشنی پیدا کر دی تھی۔ وہ الفاظ کا انتخاب نمود و نمائش کی خاطر نہیں کرتے تھے اور نہ وہ اس بات کی اجازت ہی دیتے تھے کہ الفاظ ان پر حاوی ہو جائیں بلکہ وہ تو ان کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے تھے جیسا کہ ایک دور اندیش استاد اپنے شاگردوں سے کرتا ہے یعنی کسی کو تھپکی، کسی کو سرزنش، کسی کو بیٹھنے اور کسی کو کلاس روم سے باہر نکل جانے کا حکم! چنانچہ اسی لئے ان کے اسلوب میں نہ تو کوئی شے فاضل ہوتی اور نہ کم! ایک روز میرے ہاں تشریف فرما تھے۔ میں نے پوچھا۔ "خان صاحب آپ کا ایک خاص اسلوب ہے جو اردو کے آرائشی اسالیبِ بیاں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ اسلوب آپ کو کہاں سے ملا؟" مسکرائے۔ پھر کہنے لگے۔ "میرے ایک انگریز استاد تھے۔ ایک

بار میں نے انگریزی میں ایک جواب مضمون لکھ کر انہیں دکھایا تو میرے ایک فقرے :-

IT WAS RAINING CATS AND DOGS

کو پڑھ کر پروفیسر صاحب نے معاً مجھ سے پوچھا:

HAMID! WHAT DO YOU MEAN BY THIS

میں نے کہا:

SIR! I MEAN IT WAS RAINING HEAVILY

جس پر پروفیسر صاحب نے مسکرا کر کہا:

THEN SAY SO!

بس اس ایک اشارے سے میں نے پٹے ہوئے انداز میں بات کہنے کے عمل کو خیرباد کہی اور زبان کو اس کے قدرتی انداز میں استعمال کرنے لگا:

خان صاحب تو یہ لطیفہ سنا کر رخصت ہوئے مگر میرے ذہن میں ایک ہیجان سا برپا ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد خود میرے ادبی اسلوب میں آہستہ آہستہ تبدیلی آنا شروع ہو گئی آج سے صرف چند برس پہلے ربوہ کی ایک ادبی تقریب میں خان صاحب سے ملاقات ہوئی تقریب میں میری کتاب "تخلیقی عمل" زیرِ بحث تھی۔ خان صاحب نے کہا کہ مدتوں سے میری یہ آرزو تھی کہ علمی کتاب کے لئے ایسا اسلوب اختیار کیا جائے جیسا کہ اس کتاب میں کیا گیا ہے۔ آج میری یہ آرزو پوری ہوئی — ؛ یہ بات انہوں نے بالکل رواروی میں کہی لیکن میں ان سے نہ کہہ سکا کہ یہ آپ ہی کی عطا ہے اور اس کا سلسلہ اُس شام تک پھیلا ہوا ہے جب آپ نے مجھے اپنے "جواب مضمون" والا لطیفہ سنایا تھا۔

کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ حمید احمد خان کو روحانیات سے ایک خاص شغف تھا جب کبھی وہ محسوس کرتے کہ لاہور شہر کا بوجھ بڑھ گیا ہے اور اخبارات تک اس بوجھ تلے کراہنے لگے ہیں تو وہ مولانا صلاح الدین احمد کو ٹیلی فون کرتے اور پھر یہ دونوں دوست ہمارے گاؤں کا رُخ کرتے۔ وہاں وہ میرے والد صاحب کو ملنے کے لئے جاتے تھے۔ میرے والد کا ویدانت اور تصوف کا مطالعہ بہت وسیع تھا بلکہ وہ تو بہت سے روحانی مدارج سے بھی آشنا تھے۔ میں نے اکثر دیکھا کہ

ایک پُرانے بڑ کے درخت کے نیچے خان صاحب اور مولانا صاحب گھنٹوں بیٹھے والد صاحب سے باتیں کر رہے ہوتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایسی ہی ایک ملاقات کے بعد خان صاحب نے مولانا سے کہا تھا۔ "مولانا! میں تو آج پھول کی طرح ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کا کیا حال ہے؟" جس کے جواب میں مولانا نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا تھا اور خان صاحب کا ہاتھ پکڑ کر بڑے زور سے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ آخری بار آج سے چند برس پہلے وہ ایک بار پھر ہمارے گاؤں گئے۔ لیکن اب مولانا ان کے ہمراہ نہیں تھے۔ اُدھر والد صاحب بھی اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ چنانچہ خان صاحب ان کے مزار پر فاتحہ پڑھنے کے بعد واپس آ گئے۔ اس کے بعد گاؤں میں ان کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہ رہی۔

آج جب میں نے اخبار میں پڑھا کہ خان صاحب بھی رخصت ہو گئے تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ مثلث جسے والد صاحب، مولانا اور خان صاحب کی شخصیتوں نے مرتب کیا تھا۔ اب اپنے آخری خطِ مستقیم سے بھی محروم ہو گئی ہے۔ مگر وہ مقام جس کا احاطہ اس مثلث کے مستقیم خطوط نے کر رکھا تھا آج بھی درخشاں ہے اور میں اگر چاہوں تو محض اپنی آنکھوں کو ذرا سا میچ کر اس کی تابانی میں خود کو گم کر سکتا ہوں۔

اِس مقتل میں

اخبار دیکھا تو اس کے ایک گمنام سے گوشے میں یہ خبر چھپی تھی۔

"ممتاز شاعر مجید امجد آج فرید ٹاؤن میں اپنے گھر پر مردہ پائے گئے۔ مرحوم کی میت فرش پر پڑی تھی کہ ایک شخص نے کھڑکی میں سے انہیں دیکھا جس پر دو افراد دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے تو انہیں مردہ پایا۔"

خبر پڑھی تو میری آنکھوں سے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ محض اس لئے نہیں کہ مجید امجد رخصت ہو گئے۔ انہیں رخصت تو ہونا ہی تھا کیوں کہ وہ ایک مدت سے اس کی تیاری کر رہے تھے۔ آج سے کچھ ہی عرصہ پہلے انتظار حسین نے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی "مخلوق" کو آگاہ کر دیا تھا کہ زمانہ قیامت کی چال چلنے والا ہے لہٰذا ابھی وقت ہے کہ اس مردِ درویش کے سراپا کو محفوظ کرلو ورنہ بعد میں تمہیں افسوس ہوگا۔ مگر افسوس کے بھی تو کئی رنگ ہیں۔ آنے والی نسلیں اس بات پر افسوس کریں گی کہ وہ قومی ادارے جو مرحوم کی شخصیت کو رنگ اور آواز کے لبادوں میں محفوظ کر سکتے تھے، ایک ناقابلِ فہم غفلت کے مرتکب ہوئے اور یوں انہوں نے بیسویں صدی کے ایک بہت بڑے شاعر کے سراپا کو پوری تفاصیل کے ساتھ ان تک نہ پہنچایا اسی طرح مجید امجد کی شاعری پر جان دینے والے ایک بہت بڑے طبقے کو یہ افسوس ہوگا کہ ان کا محبوب شاعر اس وقت چل بسا جب وہ اپنی ذات کے اندر بہت دور تک اُتر رہا تھا اور جس کی شاعری اس نئے داخلی تجربے کے نقوش کو سمیٹنے کے لئے لرزہ براندام ہو گئی تھی۔ مگر میری آنکھوں میں آنسو اس لئے بھی آئے کہ دیکھو ہماری بدقسمت قوم بہترین تخلیقی صلاحیت

رکھنے والے اپنے جیالے سپوتوں سے کیسا سلوک کرتی ہے کہ وہ تنہائی بے بسی اور کس مپرسی کے عالم میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرجاتے ہیں مگر اس پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔ پھر ایک صبح چند راہگیر کسی بند کمرے کی کھڑکی میں سے جھانکتے ہیں اور انہیں فرش پر کوئی لاش نظر آتی ہے — فرش پر لاش؛ کسی بے نام اور بے چہرہ فقیر کی نہیں جو سردیوں کی رات میں ٹھٹھر کر مرگیا ہو بلکہ اپنے وطن کے اس شاعر کی لاش جسے آنے والی نسلیں اقبال کے بعد ابھرنے والی دو تین منفرد آوازوں میں سے ایک قرار دیں گی اور پھر اس بات کی کوشش کریں گی کہ وہ لباس جو اس نے پہن رکھا تھا اور وہ برتن جن میں وہ کھانا کھاتا تھا اور وہ کمرہ جس میں اس نے زندگی کا بہت بڑا حصّہ گزارا — ان سب کو قومی ملکیت قرار دے کر محفوظ کرلیا جائے۔ مگر یہ تو آنے والی نسلوں کا رویہ ہوگا - اپنی نسل کا رویّہ یہ ہے کہ مجید امجد مرگیا تو اخباروں نے قتل اور اغوا اور جیب تراشی کی بڑی بڑی سرخیوں کے قدموں میں محض ایک چھوٹا سا چوکور کتبہ اُسے عطا کیا، کہ اس سے زیادہ کا اسے کوئی حق نہ تھا۔

مجید امجد کا ایک روپ تو یہ ہے کہ بحیثیت شاعر اس کا نام عظیم شاعروں کی فہرست میں شامل ہوگا اور اس کی نظمیں ذات کے جہانِ پُراسرار کی ایک ایسی سیاحت قرار پائیں گی جو اساطیر میں جے سن اور یولی سس کی مہمات کی ہم پلہ ہے اور شاعری میں ملارمے کی HERODIADE کی اس قلب ماہیت کے مماثل ہے جو انسان کو زمان و مکان کی حد بندیوں سے اوپر اٹھالیتی ہے اور مجید امجد کا دوسرا روپ یہ ہے کہ اس نے اپنی شاعرانہ عظمت کے عرفان کے باوصف ایک درویش کی سی زندگی بسر کی، خیال کیجیئے کہ ایک ایسا شاعر جس نے "زندگی اے زندگی" "آٹوگراف" "کنواں" - "مدام" "دِل دریا سمندروں ڈونگھے" اور اسی وضع کی متعدد شاہکار نظمیں تخلیق کرکے اپنی انفرادیت کا لوہا منوایا، وہ اپنی عام زندگی میں ادبی محفلوں، پبلیسٹی کے اداروں۔ اخباروں کے کالموں، ادبی شاموں، مشاعروں اور صلے اور ستائش کا کاروبار کرنے والی ٹریڈ یونینوں سے ہمیشہ الگ تھلگ رہا۔ جہاں تک مجھے علم ہے مجید امجد نے صرف ایک بار کسی ایسی ادبی محفل میں شرکت کی جو صرف ان کی ذات سے متعارف ہونے کے لئے منعقد کی گئی تھی۔ یہ ادبی محفل سرگودھا کے جناح ہال میں منعقد ہوئی اور اس میں مجید امجد نے اپنی طبیعت پر جبر کرکے اور بعض حالات

سے مجبور ہو کر شرکت کی۔ بہرحال وہ آئے اور اپنی چند نظمیں سنا کر رات کی گاڑی سے واپس چلے گئے۔ مگر ان کی شخصیت کا نقش ان لوگوں کے دلوں پر ثبت ہے جو اس روز محفل میں شریک ہوئے تھے۔ اسی محفل میں مجید امجد نے اپنی وہ معرکتہ الآرا نظم "توسیع شہر" بھی سنائی جو درختوں کی موت پر ایک نوحہ کی حیثیت رکھتی ہے اور جسے بعدازاں میں نے "ادبی دنیا" میں شائع کیا۔ اس نظم کا پہلا مصرعہ ہے ؏

بیس برس سے کھڑے تھے جو اس گاتی نہر کے دوار

اور آخری مصرعے ہیں ؏

اس مقتل میں صرف اک میری سوچ لہکتی ڈال

اس پر بھی اب کاری ضرب اک اے آدم کی آل!

اُس وقت درختوں کے کٹنے کے کربناک منظر سے متاثر ہو کر مجید امجد نے طنزاً یہ کہا تھا کہ وہ خود بھی تو ایک درخت ہے لہٰذا جہاں آدم کی آل نے اس کے اتنے قریبی ساتھیوں کو قتل کیا وہاں اُسے بھی کاٹ دیا ہوتا۔ لیکن آج میں سوچتا ہوں کہ مجید امجد نے آلِ آدم سے جو درخواست کی تھی اُسے آدم کی آل نے نامنظور نہیں کیا بلکہ "مناسب کارروائی" کے لئے فائل کر کے محفوظ کر لیا پھر جب اُسے موقع ملا تو اس نے اپنی اولین فرصت میں کلہاڑا نکالا اور اس سرسبز و شاداب پیڑ کو کاٹ کر پرے پھینک دیا۔ مگر دوسری طرف دیکھئے تو مجید امجد کو کچھ ایسی جلدی تھی کہ انہوں نے آلِ آدم کی مہیا کردہ آخری ضرب کا انتظار بھی نہیں کیا بلکہ آج سے بہت عرصہ پہلے خود ہی اپنے آپ کو منہدم کرنے کا آغاز کر دیا۔ مجید امجد کے معاملے میں خود اذیتی کی یہ صورت خودکشی کے مترادف ہرگز نہیں تھی۔ انہوں نے قطعاً غیر شعوری طور پر اس راز کو پا لیا تھا کہ شخصیت کا ارتقاء منصب اور دولت اور نام و نمود اور صلہ و ستائش میں نہیں بلکہ انہیں ترک کرنے میں مضمر ہے۔ گویا انہوں نے شخصیت کا بوجھ اٹھانے سے گریز اختیار کیا اور یوں شخصیت کو بھینی بھینی خوشبو میں تبدیل کر کے اپنے سراپا میں سمیٹ لیا۔ شاعری میں مجید امجد نے خود کو ہر قسم کے لیبل اور ٹریڈ مارک سے محفوظ رکھا اور وجود کی حدبندیوں کو توڑ کر ایک کائناتی شعور سے تعارف حاصل کیا ——————

—— عین اس وقت جب مجید امجد کے معاصرین "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ"

اور ماے غم دل کیا کروں اے وحشت دل کیا کروں " یا طبقاتی کشمکش اور جنسی بے راہروی کی باتیں کر رہے تھے۔ مجید امجد نے ذات اور کائنات کی سیاحت کا آغاز کیا وہ ذات کے اندر کے جہان کی ان سمتوں تک پہنچے جن کو چھو کر تخیل کے پَر بھی جل اٹھیں اور اس کے ساتھ ہی وہ کائنات کے اس بے نہایت پھیلاؤ میں بھی دُور دُور تک اُڑے جس کا ادراک ایک ایسا شاعر ہی کر سکتا ہے جس کا تخیل زرخیز، نظر وسیع اور جس کی تخلیقی لپک بے پایاں ہوتی ہے۔ مجید امجد ایک ایسا ہی شاعر تھا جس نے قرنوں کی آندھی میں احساس و شعور کا چراغ جلایا اور پھر اس چراغ کی روشنی میں اس نے وہ کچھ دیکھ لیا جو ضابطے اور کلیے کے تحت شعر لکھنے والوں کی گرفت میں کبھی نہیں آ سکتا۔ اس مختصر سی تحریر میں مجید امجد کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لینا مقصود نہیں۔ مقصود صرف اس کی عظمت کا اعتراف ہے اور اس افسوس کا اظہار کہ زندگی میں تو ہم نے اس عظیم شاعر کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ کیا موت کے بعد بھی ہم اس کی عظمت کے اعتراف میں اپنی اناؤں کو سینہ سپر رہنے کی اجازت دیتے چلے جائیں گے؟

برگد کا پیڑ

جب نصف دِن اِدھر اور اس کا باقی حصّہ اُدھر ہوتا ہے یعنی جب چلچلاتی دھوپ میں دوپہر کا ایک بجتا ہے اور چیل پروگرام کے مطابق اپنا انڈا چھوڑ دیتی ہے تو مجھے بے اختیار پروفیسر غلام جیلانی اصغر یاد آجاتے ہیں۔ کیوں؟ شاید اس لئے کہ میں نے جب کبھی ان کے بارے میں اپنی ایک آنکھ میچ کر سوچا ہے تو وہ مجھے برگد کے ایک ایسے پیڑ کی طرح دکھائی دیتے ہیں جس کی گھنی چھاؤں میں شہر کی ساری جلی جھلسی ہوئی چیلیں آرام کرتی ہیں لیکن پروفیسر جیلانی اور برگد کی یہ مماثلت محض یہیں تک محدود نہیں۔ وہ دوسری جملہ سطحوں پر بھی برگد سے پوری طرح مشابہ ہیں مثلاً درختوں میں شاید برگد ہی وہ واحد پیڑ ہے جس نے پروفیسر جیلانی کی طرح داڑھی چھوڑ رکھی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب برگد بوڑھا ہونے لگتا ہے تو اس کے تنے سے جڑیں برآمد ہوکر اسے ایک نئی زندگی بخشتی ہیں اور لوگ غلطی سے انہیں "داڑھی" کہہ کر پکارتے لگتے ہیں یہ بات بالکل صحیح ہے اور اسی لئے میں نے جیلانی صاحب کی داڑھی کو کبھی سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا۔ وہ مجھے ہمیشہ پروفیسر جیلانی کے چہرے سے نکلی ہوئی ایک تر و تازہ جڑ ہی نظر آئی ہے۔ خود پروفیسر مذکور نے بھی اس کے ساتھ ایک مالی کا سا سلوک کیا ہے اور اس کی تراش خراش میں قینچی، استرے مشین اور دیگر آلاتِ حرب کو بڑی نفاست سے استعمال کیا ہے اور اب تو یہ داڑھی سائنس اور ٹکینالوجی کے جدید ترین دَور میں بھی داخل ہو گئی ہے اکثر لوگ آج بھی داڑھی کی یک رنگی کو برقرار رکھنے کے لئے قرونِ وسطیٰ کے نسخے استعمال کرتے ہیں یعنی مہندی وسمہ یا خضاب وغیرہ جس کے نتیجے میں داڑھی کا رنگ کبھی کمیونسٹ اور کبھی افریقی نظر آنے لگتا ہے لیکن پروفیسر جیلانی نے

زمانے کے آدمی ہیں اور اس لئے داڑھی کو سیاہ کرنے کے لئے صرف کیمیاوی کھاد استعمال کرتے ہیں۔ اس مقدس عمل میں جدید سائنس سے فائدہ اٹھانے کی یہ واحد مثال ہے۔

برگد کے پیڑ سے جیلانی صاحب کی مشابہت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ جس طرح برگد پر پرندے آکر بیٹھتے ہیں، اس پر اپنی تیز چونچوں سے مشقِ ناز کرتے ہیں اور پھر اس کی گھنی چھاؤں میں کچھ دیر آرام کرنے کے بعد پھُر سے اُڑ جاتے ہیں، بالکل اسی طرح پروفیسر جیلانی ہر سال طلباء کی ایک پوری کھیپ کا خیر مقدم کرتے ہیں اور جب یہ کھیپ انہیں سال بھر نوچنے کے بعد آخر ایک روز اڑنے کے لئے پَر تولتی ہے تو آنسو بھری نظروں اور بھرائی ہوئی آواز میں اسے الوداع کہتے ہیں۔ اس کے بعد یہ کھیپ معاشرے میں چاروں طرف بکھر جاتی ہے اور اس کا ہر فرد کسی نہ کسی شاخ پر بسیرا کر لیتا ہے۔ ہاں اگر قسمت یاوری کرے اور وہ کسی انجانی ڈور سے بندھا ہوا یا رجیب میں آنکلے تو برگد کے پیڑ کو سلام کرنے ضرور آتا ہے کہ اس کے ٹھنڈے میٹھے سائے میں اُس نے زندگی کی بہترین گھڑیاں گزاری تھیں۔ ان آنے والوں میں وزیر بھی ہوتے ہیں اور مشیر بھی انجنیئر بھی اور وکیل بھی، پولیس کے بڑے افسر بھی اور مقدموں میں اُلجھے ہوئے عام شہری بھی۔ یہ لوگ جب یہاں سے سدھارے تھے تو ان کی آنکھیں شفّاف، چہروں کی جلد بے داغ اور ہونٹوں پر ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی۔ اب ان کی آنکھیں کھوئی ہوئی، چہرے سلوٹوں کی آماجگاہ اور ہونٹ تبسّم سے ناآشنا ہیں کہ ان پر سے وقت کا تیز رفتار رتھ بار بار گزر چکا ہے مگر جب وہ برگد کے چرنوں کو چھونے کے لئے آتے ہیں تو یہ دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ برگد وقت کی دستبرد سے کس قدر محفوظ ہے! اس کا چھتنار اسی طرح سرسبز و شاداب اور اس کے گھنے سائے میں سکون اور شانتی کا وہی عالم ہے جسے وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ سُنا ہے حرکت میں برکت ہے لیکن جیلانی صاحب کو دیکھئے تو یہ بات قطعاً غلط ثابت ہوتی ہے۔ صاف محسوس ہوتا ہے کہ اصل برکت تو حرکت کے فقدان میں ہے۔ شاید عرفان کی اصل تعریف بھی یہی ہے کہ فرد کا سارا جذباتی ہیجان ختم ہو جائے اور وہ صبح کی پہلی کرن کی طرح بے داغ اور لوتر نظر آنے لگے۔

عرفان کا ذکر آیا ہے تو برگد سے جیلانی صاحب کی مشابہت کی ایک اور سطح بھی سامنے آگئی ہے۔ مدت ہوئی جب ایک رات جیلانی صاحب نے بیوی بچوں کو الوداع کہی (ذہنی سطح پر)

اور کنتھکا کے بجائے اپنے سکوٹر پر بیٹھ کر ویرانے میں چلے گئے اور پھر برگد کے ایک پیڑ میں تبدیل ہو گئے۔ مگر گوتم اور جیلانی کی مشابہت کی یہ آخری حد ہے اور اس کے بعد ان کی طبیعتوں کا بُعد سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً آپ دیکھئے کہ گوتم نے عرفان حاصل کرنے کے لئے برگد کی تلاش کی اور پھر اس کے سائے میں بیٹھ کر سمادھی لگا دی لیکن جیلانی صاحب نے اپنی ذات کے اندر سے برگد کو جنم دیا اور پھر اپنے ہی سائے میں دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ ایک فرق اور بھی ہے وہ یہ کہ گوتم نے اپنے تن کو آہستہ آہستہ تیاگ کر اس مقام تک پہنچا دیا جہاں روح اور جسم میں بہت کم فاصلہ باقی رہ جاتا ہے لیکن پروفیسر جیلانی کو یہ مراحل طے کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وجہ یہ کہ انہوں نے پہلے روز ہی جسم اور روح کے بُعد کی نفی کر دی تھی چنانچہ جب سے اب تک ان کے ہاں تن اور من ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ اس کا ایک اہم ثبوت یہ ہے کہ وہ جب آپ سے بغل گیر ہونے کے بعد گفتگو شروع کرتے ہیں تو آپ کہہ نہیں سکتے کہ کس مقام پر پسلیوں کی چُبھن ختم اور طنز کی جراحت کا آغاز ہوا۔ یہ وصفِ خاص جیلانی صاحب کے علاوہ اور کسی ذی روح کو عطا نہیں ہوا۔ گوتم کو بھی نہیں۔

پروفیسر جیلانی ایک ایسا خودرو پیڑ ہے جس کے سائے میں شہر ـــ کی ثقافتی، ادبی، تہذیبی کاروباری اور تعلیمی زندگی نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ پروان چڑھی اور پھر چھپانے لگی۔ اگر آج سے پانچ سو یا ایک ہزار برس بعد اردو ادب کا کوئی ماہرِ لسانیات ڈاکٹر، بیسویں صدی کی پانچویں، چھٹی اور ساتویں دہائی کے شہر ـــ کی تہذیبی زندگی کے خدوخال پر تحقیق کرے گا تو اسے پروفیسر جیلانی کے سوا مشکل ہی سے کوئی اور پیڑ نظر آئے گا۔ پروفیسر مذکور شہر ـــ کی رگوں میں گرم گرم خون کی طرح رواں دواں ہیں۔ وہ صبح کالج جا کر طلباء کو درس دیتے ہیں۔ دوپہر کو اس ناچیز کے ساتھ شاعری اور فلسفے پر گفتگو کرتے ہیں۔ پچھلے پہر میاں صاحب کے زیرِ تکمیل خیراتی ہسپتال کا تخمینہ تیار کرتے ہیں یا بنولے کے اتار چڑھاؤ پر ان سے تبادلۂ خیالات کرتے ہیں۔ شام کو کہیں نہ کہیں تقریر کرتے ہیں۔ رات گئے تک مختلف سینماؤں کے سائن بورڈ پڑھتے ہیں اور پھر آدھی رات تک مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ جمعہ اور عید کے روز مسجد میں بھی نظر آجاتے ہیں۔ کبڈی کا میچ ہو یا ریڈ کراس کا مشاعرہ، جدید شاعری پر مذاکرہ ہو یا نیزہ بازی کا مقابلہ زرعی آلات کی نمائش ہو یا میوہ منڈی کا نیلام، کسی بنک کی رسمِ افتتاح ہو یا کسی معزز شہری کی رسمِ قُل،

جیلانی صاحب کی ضرورت ہر جگہ محسوس ہوتی ہے اور جیلانی صاحب کی کشادہ دلی کا یہ عالم ہے کہ وہ انکار سے اپنے ہونٹوں کو ملوث کر ہی نہیں سکتے ۔ چنانچہ ہر جگہ نظر آتے ہیں ۔ جیلانی صاحب میں شاید دس کروڑ انسانوں کی قوت (انرجی) جمع کردی گئی ہے کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتی ۔ کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ اللہ میاں نے آدم کی تخلیق کے فوراً بعد جیلانی صاحب کی تعمیر کا کام شروع کروایا ہوگا اور اس کے بعد جو تھوڑی سی انرجی باقی بچی ہوگی اس سے شہر کے باقی ادیبوں کے بے جان پتلوں میں جان ڈالی ہوگی مگر جیلانی صاحب کی یہ قوت (انرجی) تو محض سمندر کی سطح کا ایک طوفان ہے ۔ اس طوفان کی موجوں کے عین نیچے "اصلی غلام جیلانی" ایک روائتی گل محمدؒ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہے اس کی آنکھیں بند اور ہونٹوں پر ایک عارفانہ تبسم ہے ۔ ایک ایسا تبسم جو طمانیتِ قلب کا اظہارِ خفی بھی ہے ۔ اور عرفانِ ذات کا اظہارِ جلی بھی اور جو انہیں بیشتر دوسرے جلے جھلسے ہوئے پروفیسروں سے الگ اور جُدا کرتا ہے ۔

میرا البم

بے ترتیبی پھیلانا ہمارا قومی مشغلہ ہے لیکن کبھی کبھی جب ہم بے ترتیبی پھیلاتے پھیلاتے بوریت سی محسوس کرنے لگتے ہیں تو منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ترتیب اور قرینہ کی مہم شروع کر دیتے ہیں۔ یہ گویا ایک طرح کا ذہنی حکمِ امتناعی ہے جو عامل اور معمول کے میکانکی رشتے کو توڑ کر ایک طرحِ نو کا اہتمام کرتا ہے۔ ایک ایسے ہی ذہنی حکمِ امتناعی کے تحت میں نے کل صبح اپنے پرانے کاغذات کی "صفائی" اور ترتیب کا ارادہ کیا اور ہر قسم کی بیرونی مداخلت سے بچنے کے لئے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔ پھر میں کاغذات کے اُن ڈھیروں سے نبرد آزما ہو گیا جو پچھلے کئی برس سے آہستہ آہستہ فربہی کی طرف مائل ہوتے رہے تھے اور اب اچھے خاصے کاغذی پہاڑ بن چکے تھے۔ ان ڈھیروں میں کیا کچھ نہ تھا۔ اخباروں کے تراشے، تقاریب کے دعوت نامے، دوستوں کے خطوط۔ ادھوری نظمیں، نامکمل مضامین کے مسودے، ہوٹلوں کے بل، کچھ کٹی پھٹی نظمیں، رسیدیں اور نہ جانے کیا کیا کچھ — میں سوچنے لگا آخر میں نے یہ "سب کچھ" کیوں اکٹھا کر رکھا ہے کہ اب میرے لئے اس جنگل میں راستہ تلاش کرنا بھی ممکن نہیں مگر پھر مجھے خیال آیا کہ ان میں سے ہر چیز اپنے زمانے میں ضرور اہم ہو گی ورنہ میں نے اس سے بآسانی پیچھا چھڑا لیا ہوتا یا ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ انسان کی ذات میں چھپا ہوا طفلِ مادہ پرست اُسے اشیاء جمع کرنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے اور پھر ایک روز یہ جمع شدہ اثاثہ اتنا وزنی ہو جاتا ہے کہ اس بوجھ تلے اُس کا اپنا سانس بھی رُکنے لگتا ہے۔ پس جب بوجھ اتنا بڑھ جائے کہ سانس لینا بھی دشوار نظر آئے تو یہ مناسب ترین وقت ہے کہ فی الفور کوئی ذہنی ضابطہ نافذ کر کے خود کو سبکسار کرنے کی مساعی کا آغاز

کر دیا جائے۔

مگر تجربہ شاہد ہے کہ خود کو سبکسار کرنے کی یہ مہم اپنے ابتدائی خروش کے بعد بڑی تیزی سے کم زور پڑتے لگتی ہے اور پھر کسی ایک مقام پر رُک کر اپنی ساری منصوبہ بندی سے قطع تعلق کر لیتی ہے۔ یہ مہم ایک طرح کی سمندری موج ہے جو اپنی اولین یلغار میں سطحِ سمندر پر پھیلی ہوئی انگشت بدنما سلوٹوں پر پانی تو پھیرتی ہے مگر جب اس کے بعد رُکتی ہے تو سمندر کی سطح پر پہلے سے بھی زیادہ سلوٹیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ میرے معاملہ میں یہ ہوا کہ کاغذات کو الٹتے پلٹتے، گرد و غبار میں راستہ بناتے اور بعض دیمک زدہ مسودات کو الگ کرتے ہوئے مجھے اچانک ایک نہایت بدوضع اور کرم خوردہ سا پیکٹ دکھائی دیا اور میں لحظہ بھر کے لئے رُک گیا تاکہ اُسے کچھ سونگھ لوں تو آگے بڑھوں اس وقت مجھے اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ میرا یہ رُکنا مستقل نوعیت کا ہوگا اور میں کچھ اس طور کھو جاؤں گا کہ میرے ذہن سے صفائی کا جن ہی رخصت ہو جائے گا۔ یہ پیکٹ دراصل میرا ایک بہت پرانا البم تھا جو آج سے کئی برس پہلے گم ہوا اور پھر تلاشِ بسیار کے باوجود ہاتھ نہ آسکا اور اب کہ میں اس کی ضرورت بلکہ وجود تک سے بے نیاز ہو چکا تھا تو وہ ایک بھولی بسری یاد کی طرح وقت کی شاخ سے ٹوٹا اور میری پھیلی ہوئی جھولی میں آن گرا۔

میں نے البم پر سے گرد جھاڑنے کے لئے اسے ہلکی سی تھپکی دی اور پھر اس کے پھُولے ہوئے چمڑے کی جلد کو ایک طرف سے اوپر اٹھایا۔ تب اچانک البم کے پہلے ہی صفحے پر مجھے ایک چمکتی ہوئی تصویر دکھائی دی۔ پہلی نظر میں تو میں ان صاحب کو پہچان بھی نہ سکا جو سر پر سیاہ بالوں کا ایک گھنا جنگل اٹھائے، ایک کالی عبا زیبِ تن کئے اپنے سیدھے ہاتھ کے پنجے میں ایک لمبی اور گول سی کاغذ کی نلکی مضبوطی سے پکڑے ، فوٹو گرافر کے حکم کی تعمیل میں اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ ایک بھیگی سی خفت آمیز مسکراہٹ سجائے کھڑے تھے۔ مگر پھر دوسرے ہی لمحے میں نے ان صاحب کو پہچان لیا کیوں کہ یہ میری ہی تصویر تھی، اس روز آج سے تقریباً تیس سال ادھر، مجھے ایم اے کی سند ملی تھی اور میں بھاگم بھاگ انارکلی کے ایک پارسی فوٹو گرافر کے سٹوڈیو میں جا پہنچا تھا۔ میں سوچنے لگا نجانے وہ فوٹو گرافر اب زندہ بھی ہے یا نہیں اور وہ کرائے کی کالی عبا؛ اب تک ضرور تار تار ہو چکی ہوگی اور وہ ایم اے کی حسین سند؟ کہاں ہے وہ سند؟ ان کاغذوں کے انبار میں دیمک کے متعدد اور مسلسل حملے

سہنے کے بعد اپنے مسخ شدہ چہرے کو چھپائے کہیں نہ کہیں ضرور دبکی پڑی ہوگی۔ شاید کسی روز البم کی طرح وہ بھی دکھائی دے جائے۔

میں چند صفحے آگے بڑھا تو مجھے ایک مدھم سی تصویر دکھائی دی جو کسی سستے کیمرے اور اناڑی فوٹوگرافر کی چغلی کھا رہی تھی۔ تصویر ایک پہاڑی علاقے کی تھی۔ پس منظر میں چیل کے درختوں سے لدا ہوا ایک پہاڑ کھڑا تھا اور پہاڑ کے قدموں میں ایک کائی زدہ چٹان پر پھولے ہوئے گالوں اور چمکتی ہوئی آنکھوں والے دو لڑکے بیٹھے تھے۔ ان میں ایک شمس تھا اور دوسرا میں! پھر مجھے یاد آیا کہ اُس روز میں شمس کے دادا جان کی پہاڑی اقامت گاہ پر انہیں سلام کرنے گیا تھا اور انہوں نے اپنے چار پانچ پوتوں کی قطار میں مجھے ایک قابلِ عزت مقام پر بٹھا کر گھنٹہ بھر اخلاقیات پر لیکچر دیا تھا اور جب ہماری حالت غیر ہونے لگی تھی تو ازراہِ کرم اپنی آستین سے ایک چتکبرا کیلا نکال کر ہم میں تقسیم کر دیا تھا۔ شمس کے دادا جان ایک نہایت کنجوس مگر بڑے ہی شفیق اور انصاف پسند بزرگ تھے۔ اس روز بھی انہوں نے اس اکلوتے کیلے کو تقسیم کرنے سے پہلے اس پر پنسل سے نشانات لگائے تھے تاکہ ہم میں سے کسی کی حق تلفی نہ ہو اور پھر کیلے کو گنڈیریوں کی طرح کاٹ کر ہم میں تقسیم کر دیا تھا۔ پھر جب ہمیں چھٹی ملی تھی تو ہم دادا جان کے کمرے سے آزاد کیے گئے قیدیوں کی طرح دیوانہ وار نکلے تھے اور پہاڑی بکروں کی طرح قلانچیں بھرتے ہوئے چٹانوں پر چڑھ گئے تھے یہ تصویر اسی جشنِ آزادی کے موقعہ پر ہمارے کسی ہم عمر نے اتاری تھی۔ وہ ہم عمر کون تھا؟ کچھ یاد نہیں!

البم کے اگلے صفحے پر مجھے ایک ایسی تصویر دکھائی دی کہ ایک پورا دَور ہمک کر میری گود میں آگرا۔ اس تصویر میں میری والدہ پلنگ پر بیٹھی تھیں۔ سامنے کھانے کا ٹرے رکھا تھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں لقمہ تھا اور دوسرے میں ہاتھ کا پنکھا! پاس ہی میرے بڑے بھائی جان بیٹھے تھے۔ نجانے انہوں نے کیا بات کہی کہ والدہ بے اختیار ہنس پڑیں۔ عین اُس وقت میں نے اپنے کیمرے کا رُخ ان کی طرف کیا اور اس درخشاں لمحے کو کاغذ پر منتقل کر لیا۔ میری والدہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور بڑے بھائی جان بھی رخصت ہو چکے مگر یہ ہنستا ہوا منور لمحہ بدستور زندہ ہے۔ ایک مدت کے بعد میں نے اپنے کھوئے ہوئے البم میں اس لمحے کو پہلی سی تابانی کے ساتھ ہنستے ہوئے دیکھا تو خود بھی کھِل اٹھا جیسے کوئی بہت بڑا انعام مِل گیا ہو۔

میں البم کے گہرے غار میں اترتا چلا گیا ۔ اس غار کے ہر موڑ پر مجھے کوئی نہ کوئی لمحہ دست بستہ کھڑا ملا ۔ بعض لمحے جو نووارد تھے، بڑی آسانی سے یاد کی گرفت میں آ گئے لیکن بعض لمحے ایسے بھی تھے جو یادداشت کی سرحد پار کر چکے تھے اور اب منت سماجت پر بھی واپس آنے کو تیار نہ تھے ۔ یوں بھی زمانے کی مرطوب ہوا نے ان پر سبز کائی کا ایک غلاف کچھ اس طور چڑھا دیا تھا اور ان کے خدوخال اس حد تک ماند پڑ گئے تھے کہ اب ان سے وابستہ کوئی ایک یاد بھی باقی نہیں تھی ۔ اگر میرے البم میں صرف اسی ایک قسم کے متحجرات ہوتے تو میں فی الفور اسے دوبارہ ردی کے انبار پر پھینک دیتا مگر اس میں درجنوں تصاویر ایسی بھی تھیں جو نظر کے ہلکے سے لمس پر باقاعدہ دھڑکنے اور سانس لینے لگتیں اور ان سے منسلک ایک پورا عہد انگڑائی لے کر بیدار ہو جاتا ۔ شاید البم کی سب سے بڑی خوبی بھی یہی ہے کہ وہ اپنے دامن میں زندہ اور متحرک لمحوں کی ایک پوری کھیپ چھپائے ہوتا ہے ۔ اگر البم کی تصویریں یاد کے نورانی حلقوں سے محروم ہو جائیں اور ان سے وابستہ، چمکتے ہوئے لمحات بجھ جائیں تو البم البم نہیں رہتا تصویروں کا مردہ خانہ بن جاتا ہے ۔ البم تو البم والے کی شخصی جائیداد ہے لیکن ایک ایسی جائیداد جسے کوئی اور اپنے تصرف میں لا ہی نہیں سکتا وجہ یہ کہ البم لاجونتی کی طرح ہے ۔ اسے کوئی نامحرم ہاتھ مس کرے تو فوراً مرجھا جاتا ہے ۔ ہاں جب پیار بھری مانوس نظریں اس کی طرف اٹھتی ہیں ۔ نظریں جو بہت کچھ جانتی ہیں تو یہ ہمکنے اور کلیلیں کرنے لگتا ہے ۔ بالکل آپ کے معصوم بچے کی طرح !

روشنی ماند پڑنے لگی تھی ۔ میں نے اپنے "یوسفِ گم گشتہ" کو اٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور پھر بڑی محنت سے الگ کئے ہوئے مسودات کو دیمک زدہ کاغذی پہاڑوں پر جگہ جگہ ڈھیر کر دیا ۔ اب کمرے کا انتشار پہلے سے بھی کئی گنا نظر آ رہا تھا ۔ فضا میں گرد کے لاکھوں ذرات اُڑ رہے تھے اور میرا سانس رُکنے لگا تھا ۔ مگر میرا البم میری جیب کے اندر ضیا پاش تھا اور خوشی میری آنکھوں سے پھوٹ رہی تھی !

شادؔ کا غم

شادؔ امرتسری کو میں نے پہلی بار غالباً ۱۹۴۶ء میں حلقۂ اربابِ ذوق کی ایک محفل میں دیکھا تھا۔ اس روز وہ امرتسر سے حلقہ میں اپنی غزل سنانے کے لئے آیا تھا۔ یہ تو یاد نہیں کہ غزل کے بارے میں اس روز کیا باتیں ہوئیں۔ ہاں اتنا یاد ہے کہ اس محفل کا دولہا شادؔ امرتسری تھا۔ یہ اس کے آغازِ شباب کا زمانہ تھا اور کشمیری خون اور رنگت نے اس کی وجاہت کو دو چند کر رکھا تھا۔ اس پر مستزاد اس کی ہنس مکھ طبیعت جو محفل کو زعفران زار بنا رہی تھی۔ اس کے بعد تقسیم کا ہنگامہ برپا ہوا۔ کچھ عرصہ کے لئے محفلیں درہم برہم ہو گئیں میں خود بھی ادبی مراکز سے کٹ کر ایک دور افتادہ گاؤں میں سر چھپائے بیٹھا رہا لیکن اس کے بعد جب غالباً ۱۹۵۰ء کے لگ بھگ دوبارہ حلقۂ اربابِ ذوق کی محفلوں میں شریک ہوا تو میں نے دیکھا کہ امرتسر کا مہاجر اب حلقے پر پوری طرح چھا چکا تھا۔ جب حلقے میں کوئی غزل، نظم، افسانہ یا مضمون پیش ہوتا اور تنقید کا مرحلہ سامنے آتا تو صاحبِ صدر کی نظریں شادؔ امرتسری کو تلاش کرتیں اور بالآخر اس پر جم کر رہ جاتیں اور تب "شادؔ امرتسری تنقید کا آغاز کریں گے" کے الفاظ معاً گونج اٹھتے۔ ادھر شادؔ تھا کہ اس نے کبھی تنقید کا آغاز کرنے میں ہچکچاہٹ یا انکسار کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے یہ بھی حلقے کی ایک روایت بن چکی ہے کہ تنقید کا آغاز شادؔ امرتسری سے ہوگا۔ خود شادؔ صاحبِ صدر کی جنبشِ ابرو کا اشارہ پاتے ہی ذرا سا مسکراتا، ایک نظر اپنی مملکتِ خداداد پر ڈالتا اور بڑے معتدل لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگتا۔ پھر یکایک محفل چہک اٹھتی۔ تابڑ توڑ حملے شروع ہو جاتے اور

صاحبِ مضمون یا صاحبِ صدر کے بجائے شاد امرتسری مرکزِ نگاہ بن جاتا۔ لیکن میں یہ دیکھ کر بڑا حیران ہوتا تھا کہ شاد نے کبھی اپنے نظریات کے ضمن میں ضد یا ہٹ دھرمی کا مظاہرہ نہیں کیا اُس میں بلا کی سپورٹس مین سپرٹ تھی اور جب وہ دیکھتا کہ فریقِ مخالف کی دلیل زیادہ وزنی ہے تو مسکرا کر اُسے قبول کر لیتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ یہ سپورٹس مین سپرٹ اُس نے کھیل سے اخذ کی تھی کیوں کہ جہاں تک مجھے علم ہے وہ کاروبارِ عشق، موسیقی اور ساغر و مینا کے علاوہ اور کسی کھیل میں شاید ہی دلچسپی لیتا تھا۔ ممکن ہے یہ شراب کا اثر ہو کیونکہ شراب ہزار دوسرے مضر اثرات کا منبع سہی، اس کا متوالا ریاکاری سے ضرور محفوظ رہتا ہے۔

مجھے قطعاً یاد نہیں کہ شاد امرتسری سے میری دوستی کا آغاز کب اور کن حالات میں ہوا۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن سے دوستی کسی ابتدا کی مرہونِ منت نہیں ہوتی۔ زندگی کے کسی موڑ پر ان سے آپ کی اچانک ملاقات ہوتی ہے اور آپ کو یوں لگتا ہے جیسے آپ انہیں جنم جنم سے جانتے ہیں۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ ہم ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ ایک دوسرے کے دوست بن چکے تھے میں ان کے دلِ محمد روڈ والے مکان کی بیٹھک میں چلا جاتا۔ وہاں شاد میز پر بوتل اور گلاس سجائے شغلِ مے نوشی میں غرق ہوتا۔ مجھے دیکھتے ہی بڑے اہتمام سے مصافحہ کرتا۔ اپنے پاس بٹھاتا۔ مسکرا کر ایک نظر سجی سجائی میز پر ڈالتا۔ کہتا ــ "آپ کے لئے کچھ ــ؟" اور جب میں انکار میں اپنا سر ہلاتا تو کہتا "اچھا تو میں جاری رکھوں؛ باتیں بھی ہوں گی۔" اُسے معلوم تھا کہ میں شراب نہیں پیتا لیکن شاید وہ پینے پلانے والے کی روایتی کشادہ دلی سے مجبور تھا کہ کم از کم ایک بار تو مجھے اس "کارِ خیر" میں شرکت کی دعوت ضرور دے ڈالتا۔ اس بیٹھک میں لاتعداد دوسرے ادباء سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یہیں انجم رومانی اور منیر نیازی صاحب سے دوستانہ مراسم قائم ہوئے۔ ایک روز ہم چاروں نے ایک یادگار تصویر بھی اتروائی جو بعد ازاں "ادبِ لطیف" میں شائع ہوئی لیکن یہ چار یاری زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔ انجم رومانی صاحب اپنی ذات کے خول میں سمٹ گئے۔ منیر نیازی صاحب خول سے باہر نکل گئے۔ البتہ شاد سے ملاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ ایک بار وہ میرے گاؤں میں بھی آیا۔ اور کئی روز ٹھہرا ہم اکثر باتیں کرتے ہوئے بہت دور کھیتوں میں نکل جاتے اور پھر کسی کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر خدا اور کائنات، زندگی اور موت ایسے لاینحل مسائل پر گھنٹوں گفتگو کرتے رہتے۔ شاد کو فلسفے سے

بڑا گہرا لگاؤ تھا۔

اس مختصر سی تحریر میں شاد امرتسری کی نظموں غزلوں کے بارے میں کچھ لکھنا ممکن نہیں لیکن اگر میں یہ کہوں کہ اس نے بعض ایسی نظمیں اور غزلیں لکھی ہیں جو جدید اردو شاعری کے کڑے سے کڑے انتخاب میں بھی ضرور شامل ہوں گی تو اس میں غلو کا شائبہ تک نہیں ہوگا۔ شعر کے علاوہ شاد نے بڑی میٹھی کومل زبان میں موسیقی اور ادب پر ایسے خوبصورت مضامین لکھے ہیں کہ ان کے خیال ہی سے قندِ مکرر کا لطف آنے لگتا ہے۔ موضوع کی طرف اس کی پیش قدمی میں ہمیشہ احساس کی تڑپ شامل ہوتی تھی۔ غالباً اس لئے کہ وہ بنیادی طور پر ایک فن کار تھا۔

شاد امرتسری بیالیس سال کی عمر پاکر ہم سے رخصت ہوگیا۔ روایتی الفاظ میں تو شاید یوں کہا جائے کہ موت کا بے درد ہاتھ اُسے ہم سے چھین کر لے گیا لیکن امرِ واقعہ یہ ہے کہ شاد نے خودکشی کی — ایک طویل، کرب انگیز اور آہستہ خرام خودکشی! وہ کہتا — "میں شراب پیتا ہوں، دوستوں میں بیٹھ کر فلک شگاف قہقہے لگاتا ہوں، نغمی متی لاتعداد محبتیں کرتا ہوں، نظمیں اور مضامین لکھتا ہوں لیکن دراصل یہ سارے نقاب ہیں جو میں نے اپنے گہرے گھاؤ کو چھپانے کے لئے پہن رکھے ہیں —" مگر بات یہ ہے کہ یہ گھاؤ تو اس کی روح کے اندر تھا۔ اوائل شباب کی ایک کربناک محرومی، محبت کے ایک المیے نے اس شخص کی زندگی کی جہت ہی بدل ڈالی تھی۔ وہ ساری عمر اپنے خیال کی چبھن سے خود کو بچاتا رہا حتیٰ کہ اس تگ و دو میں اس کے بدن کی ڈھال ہی ریزہ ریزہ ہوگئی۔ اس کی ذات میں ایک بہت بڑا فن کار چھپا بیٹھا تھا۔ اگر یاد کے کچوکے ذرا کم ہوجاتے یا ڈھال ذرا زیادہ مضبوط ہوتی تو دیکھنے والے دیکھتے کہ وہ کیا کچھ نہیں تھا۔

عجیب بات ہے کہ اردو ادب کے جدید دور میں اپنی آگ میں جل مرنے والوں کی تعداد اب خاصی ہوگئی ہے — شمس آغا۔ اسرارالحق مجاز۔ میراجی۔ منٹو۔ راجہ مہدی علی خان — یہ سب اپنی ہی آگ میں بھسم ہوگئے اور آج جب میں نے انگریزی اخبار کے ایک تاریک گوشے میں ایک بار پھر آگ کے شعلے کو رقص کرتے ہوئے دیکھا تو معاً میں نے سوچا کہ جو کچھ ویت نام اور جنوبی ہند کے دور دراز گوشوں میں ہوتا ہے، وہ کبھی کبھی ہمارے گھر کی دہلیز کے باہر بھی ہوجاتا ہے۔ حسّاس شخص جہاں کہیں بھی ہے، وہ آگ میں ضرور کودے گا۔ اُسے آگ میں کودنے سے کون روک سکتا ہے؟

بھولی بسری یادیں

(ا)

یہ آج سے کم وبیش بیس برس پہلے کا واقعہ ہے۔ ان دنوں مجھے شکار کا شوق جنون کی حد تک تھا اور میں ہر تیسرے چوتھے روز اپنے گاؤں سے کئی میل دور ایک جھیل پر مرغابی کے شکار کے لئے جایا کرتا تھا۔ دسمبر جنوری کی منجمد کر دینے والی سردی میں رات کے پچھلے پہر بیدار ہونا اور بندوق کاندھے سے لٹکائے میلوں میل پیدل سفر کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ میں پو پھٹنے سے پہلے ہی جھیل کے کنارے جا پہنچا اور ایک جھاڑی کی اوٹ میں کھڑے ہو کر مرغابیوں کا انتظار کرنے لگا۔ ایسے وقت میں مرغابیاں جیٹ ہوائی جہازوں کی طرح آتی ہیں اور جھیل کے صاف شفاف رن وے پر لینڈ کرتی چلی جاتی ہیں۔ جب وہ نیچے آ رہی ہوں تو انہیں بندوق کا نشانہ بنانا نسبتاً آسان ہوتا ہے مگر نجانے کیا بات ہوئی کہ اُس روز قدرت کے یہ جیٹ ہوائی جہاز قدرے تاخیر سے آئے۔ تاہم وہ بڑی تعداد میں آئے اور اُن کے پروں کی جھنکار ایک سرمدی نغمے کی طرح ساری فضا پر چھا گئی۔ تب نیل سروں کی ایک ڈار نے میرے نہایت قریب آکر پانی میں اترنے کے لئے اپنے زاویے کو ذرا سا تبدیل کیا اور ابھرتے ہوئے سورج کی ایک نٹ کھٹ شعاع نے اس پر زرد رنگ کی پچکاری چھوڑ دی اور پوری ڈار ایک نقرئی جھالر میں تبدیل ہو کر جھیل کی سطح سے جا ٹکرائی۔ مجھے محسوس ہوا کہ چاروں طرف ایک سحر طراز روشنی پھیل رہی ہے۔ جھیل کی سطح چاندی کا ایک تھال سا بن گئی ہے جس پر مرغابیاں سونے کی ڈلیوں کی طرح جابجا بکھر گئی ہیں۔ ایسا دلربا منظر میں نے زندگی میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی عنکبوت کے سنہری جال میں جکڑ دیا گیا ہوں اور بندوق کی لبلبی دبانے کی مجھ میں سکت ہی باقی

نہیں رہی۔ تب میں سوچنے لگا کہ قدرت نے آج کس فراخدلی سے میرے سامنے رنگ و نور کی ایک چادر سی پھیلا دی ہے اور میں ہوں کہ اس نورانی چادر کو خون کے دھبّوں سے داغدار کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ بس وہ دن اور آج کا دن، میں نے پھر کبھی کسی پرندے کو بندوق کا نشانہ نہیں بنایا۔ نشانہ بنا ہی نہیں سکا۔ مجھے شکار کا بے حد شوق تھا اور اس لئے میں نے متعدد بار اس واقعہ کو بھول جانے کی کوشش کی تاکہ میں اپنے مشغلے کو جاری رکھ سکوں لیکن کہاں ؟ کیونکہ ہر بار جب میں بندوق کو چھوتا تو میری چشمِ تصور کے سامنے وہی سحر طراز روشنی اڑتی چلی آتی جس پر مرغابیوں کی ایک ڈار کسی سنہری جھالر کی طرح چمک رہی ہوتی اور میں گھبرا کر بندوق کو یوں پرے پھینک دیتا جیسے میرے ہاتھوں نے لوہے کی تپتی ہوئی سلاخ کو چھو لیا ہو۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ میں نے شکار اور شکار کے ساتھ ساتھ اس روز کے دلربا منظر کو بھی اپنے ذہن سے خارج کر دیا مگر لاشعور سے شاید یہ واقعہ پوری طرح محو نہ ہو سکا کیوں کہ پچھلے دنوں ایک نظم لکھتے ہوئے جب یہ چند مصرعے نوکِ قلم سے ٹپکے تو مجھے برسوں پرانے اس واقعہ ہی کی یاد دلا گئے۔ یہ گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ لاشعور نے اس واقعہ کو فراموش نہیں کیا:

جب آنکھ کھلی میری
دیکھا کہ ہر اک جانب
زرتار سی کرنوں کا
اک زرد سمندر تھا
اور زرد سمندر میں
چاندی کی پہاڑی پہ
میں پیڑ تھا سونے کا
شاخوں میں مری ہر سو
جھنکار تھی پتّوں کی
اُڑتی ہوئی چڑیوں کی
یا آگ کی ڈلیوں کی
اک ڈار سی آئی تھی

اور مجھ میں سمائی تھی
قدموں کے تلے میرے
زنجیر تھی لمحوں کی
میرے ذرہ پیکر سے
جو کوندا لپکتا تھا
تاروں کے جھروکوں تک
پل بھر میں پہنچتا تھا
میں جسم کے مرقد سے
باہر بھی تھا، اندر بھی
میں خود ہی پہاڑی تھا
اور خود ہی سمندر بھی!

(۲)

یہ شاید ۱۹۴۶ء کا واقعہ ہے۔ میں تعلیم سے فارغ ہو چکا تھا اور اب ایک آوارہ گرد کی طرح جگہ جگہ کا پانی پیتا آخر ایک روز کشمیر جا پہنچا تھا۔ ان دنوں اچھابل میں فقط ایک ہی ہوٹل تھا۔ ایک ننھا اور مغموم سا ہوٹل جس میں بھولے بھٹکے سیاح چند روز کے لئے رک جاتے تھے۔ جس دن میں نے اس ہوٹل میں قدم رکھا اسی روز ایک پورا ہندو خاندان بھی وہاں اُترا اور میرے ساتھ والے کمرے میں پناہ گزیں ہو گیا۔ اس قافلے میں ایک بالکل نیا شادی شدہ جوڑا بھی تھا جو غالباً ہنی مون منانے کے لئے کشمیر آیا تھا اور ہنی مون کو کامیاب بنانے کے لئے دولہا دلہن کا سارا خاندان بھی ساتھ ہی چلا آیا تھا۔ چنانچہ دولہا دلہن ایک عجیب سی کس مپرسی کے عالم میں تھے۔ اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں انہیں مختصر تنہائی کا ایک لمحہ بھی حاصل نہیں تھا۔ لڑکی تو کسی نہ کسی طرح اپنے ہونٹوں پر ایک مصنوعی تبسم چپکائے اپنی بہنوں اور نندوں سے مصروف گفتگو رہتی لیکن دولہا میاں پر بے بسی اور اُداسی

اس درجہ مسلط ہوگئی تھی کہ ان کے ہونٹوں پر تبسم کی کوئی باریک سی لکیر بھی باقی نہیں رہی تھی۔ جب دوپہر کو یہ سارا خاندان نیچے رسوئی میں بھوجن تیار کرنے کے لئے چلا جاتا اور ازراہِ احتیاط دلہن کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا تو دولہا میاں برآمدے میں کرسی بچھاکر بیٹھ جاتے اور حسرت بھری نگاہوں سے سامنے کے برف پوش پہاڑوں کو ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہتے۔ ان کی حالت قابلِ رحم تھی اور وہ کبھی کبھی اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے پانی کے قطروں کو ریشمی رومال سے پونچھ بھی لیتے تھے۔ دلہن کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوگا۔ چنانچہ ان دونوں کے لئے ہنی مون قیدِ تنہائی کا ایک طویل جانسوز وقفہ بن کر رہ گیا تھا۔ دو تین روز یونہی گذر گئے۔ اور میں بڑے غور سے اس سارے ڈراما کو دیکھتا رہا۔ پھر ایک دوپہر جب دولہا میاں حسبِ معمول اداس اداس نظروں سے سامنے کے پہاڑوں کو گھور رہے تھے اور میں برآمدے کے ستون کا سہارا لئے نیچے صحن میں ایک موٹے سے لالہ جی کو پوڑی حلوہ کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، تو دفعتہً سیڑھیوں پر دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی اور میں نے دیکھا کہ دلہن اپنے پیچھے بار بار پلٹ کر دیکھتے ہوئے تیز تیز قدموں سے دولہا میاں کی طرف لپکی چلی آرہی ہے۔ جب وہ ان کے قریب پہنچی تو فرطِ مسرت سے دونوں کا رنگ سُرخ ہوگیا ہونٹوں پر تبسم کی لہریں جگمگا اٹھیں اور آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک اُبھر آئی۔ بے اختیار دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا۔ پھر یکایک دولہا نے دلہن کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں سمیٹ لیا اور دلہن کی شفاف اور چمکتی ہوئی آنکھوں کے آئینے میں اپنے چہرے کا عکس دیکھنے لگا۔ غالباً دونوں کو اس بات کا علم تک نہیں تھا کہ میں بھی برآمدے میں کھڑا ہوں یا ممکن ہے انہوں نے اس بات کی پرواہ ہی نہیں کی۔ زندگی کی ہما ہمی، شوریدہ سری اور ہنگامہ خیزی سے چرائے ہوئے اس لمحے میں ایک ایسا ملکوتی حسن، ایک ایسی لازوال پاکیزگی اور سندرتا تھی کہ اس کی یاد میری لوحِ دل پر آج تک کندہ ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ یہ پل بے حد مختصر تھا کیوں کہ دوسرے ہی لمحے دلہن کی چھوٹی بہن "دیدی دیدی" پکارتی اُس کے پیچھے آگئی تھی اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو کر پھر سے اجنبی ہو گئے تھے۔

(۳)

یکم دسمبر ۱۹۴۷ء کی اُس رات کا منظر تو مجھے عمر بھر بھول نہیں سکے گا اور اگر کبھی زندگی کی بہترین گھڑیاں گننے کی فرصت میسر آئی تو میں ان چند لمحات اور ان سے وابستہ تصورات کو اسی طرح تازہ اور شاداب حالت میں پاؤں گا۔ رات تاریک تھی اور سرد۔ میرے کمرے میں لیمپ جل رہا تھا اور ایک طرف دن بھر کا تھکا ہارا۔ ریڈیو چپ چاپ، مضمحل انداز میں پڑا تھا جیسے اپنے ہی افکار کی تُندی کے ہاتھوں اس قدر مجبور ہو کہ اگر آج اس سے قوتِ اظہار چھن گئی تو پھر شائد اس کی زبان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گنگ ہو کر رہ جائے گی ۔۔ لیمپ جل رہا تھا، رات تاریک تھی اور ریڈیو چپ اور تنہا۔ اس وقت نجانے مجھے کیا ہوا کہ میں نے اٹھ کر کمرے کی وہ کھڑکی کھول دی جس کا رُخ مشرق کی طرف ہے اور جس میں سے دن کو درخت اور دور دُور تک بچھے ہوئے کھیت صاف نظر آیا کرتے ہیں۔ پھر میں نے لیمپ بجھا دیا اور وہ تاریکی جو باہر گم سُم کھڑی تھی، چشم زدن میں لپک کر کمرے کی تمام اشیاء پر مسلط ہو گئی۔ پھر میں نے ریڈیو کھول دیا اور نغمے کی ایک لطیف اور پُر اسرار سی لَے میرے کانوں کو آہستہ آہستہ مَس کرنے لگی میں چارپائی پر نیم دراز ہو گیا ۔ اس طور کہ کھُلی ہوئی کھڑکی میرے رُو برو تھی اور درختوں کے ہیولے مجھے اپنی جھلک دکھا رہے تھے ۔ اب تاریکی تھی، نغمے کی ہلکی سی لَے اور چاروں طرف ٹھٹھکی ہوئی خاموشی! اور پھر یکایک درختوں اور کھیتوں کے پار مشرقی افق پر ہلکی سی روشنی نمودار ہوئی اور ننھی منی بدلیوں کے کنارے سیمیں ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ جیسے نغمے کے طلسماتی اثر سے مدہوش سولھویں رات کے چندرما نے بدلیوں کی پٹاری سے اپنا سر نکالا۔ درخت ذرا اور نمایاں ہو گئے بدلیاں کچھ اور سیمیں ہو گئیں ۔ نغمہ کچھ اور میٹھا ہو گیا اور کائنات کی حسینہ نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر ایسی مخمور نگاہوں سے میری طرف دیکھا کہ فرطِ طرب سے میرے آنسو نکل آئے۔ میں نے سوچا یہ دنیا ہزار بدنما اور اپاہج سہی ، انسانی فطرت ہزار تنگ دل اور بے مروّت اور نظامِ عالم ہزار پرانا اور پامال سہی ، قدرت آج بھی کس فراخدلی سے اپنے حسنِ ازل کی تجوریوں کا منہ کھولے ہوئے ہے اور ہمیں ان سے مُٹھیاں بھر لینے کی صلائے عام دے رہی ہے مگر ہم ہیں کہ اپنی چھوٹی چھوٹی دشمنیوں اور رنجشوں کے دھاگے میں اسیر اور ننھے ننھے مقاصد

کی ڈور سے بندھے ہوئے، سسکتے اور بلکتے چلے جا رہے ہیں!
میرے لئے یہ لمحہ آج بھی حاصلِ زندگی ہے!

میرا کُتب خانہ

میرا کتب خانہ دراصل میری زندگی کی داستان ہے لیکن میں اسے اپنے احباب کی ایک محفل بھی کہہ دوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ محفل کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا کہ پچھلے بیس پچیس برس میں جب کبھی کسی نئے مصنف کی کتاب میرے کتب خانے میں داخل ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے دوستوں کی محفل میں ایک نئے دوست کا اضافہ ہوا اور یہ دوست بھی عجیب تھا۔ عام زندگی کے دوست تو جذبات کا ایک پٹارہ ہیں اور ان سے نباہ کرنا کانٹوں کی سیج پر قدم رکھنے کے مترادف ہے۔ ادھر آپ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کوئی بات کہی، محض تفننِ طبع کی خاطر کوئی جملہ اختراع کیا اور اُدھر دوست کی خوبصورت پیشانی پر سلوٹیں نمودار ہو گئیں اور برسوں کی محنت سے تعمیر کئے گئے دوستی کے ایوان میں دراڑیں نمودار ہونے لگیں۔ میرے کتب خانے کا "دوست" جذبات کے اس جوار بھاٹا سے قطعًا محفوظ ہے۔ پھر وہ اپنے خاص موڈ کے رحم وکرم پر بھی تو نہیں۔ عام زندگی کے دوست صرف اس وقت آپ سے کُھل کر باتیں کریں گے۔ جب ان کی ذات کی شخصی، قومی اور بین الاقوامی نوک پلک درست ہوگی۔ یعنی جب ان کا ہاضمہ ٹھیک، جیب پُر اور موُڈ درست ہوگا۔ لیکن میرے کتب خانے کا "دوست" ہر لحظہ مجھ سے باتیں کرنے بلکہ کُھل کر باتیں کرنے پر مستعد نظر آتا ہے۔ اور یہ دوست بھی کس مرتبے، کس مقام کا مالک ہے! یکایک کسی لمحہ خود فراموش میں آپ کی نظریں دیوار کی طرف اُٹھ جاتی ہیں۔ اور وہاں شیکسپیئر، غالب، کالیداس، ہومر یا ڈانٹے کی نظروں سے دوچار ہو جاتی ہیں۔ آپ کی نظروں کا تجسس فوقِ ثانی کی نظروں میں ایک پُر لطف سی مسکراہٹ پیدا

کر دیتا ہے۔ آپ ذرا سا کسمسا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ الماری میں سے اپنے دوست کو انگلی سے لگائے واپس کرسی پر آ بیٹھتے ہیں اور یکایک بغیر کسی ہچکچاہٹ یا تکلف کے آپ کا یہ دوست آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے۔ ان باتوں میں کوئی ڈھکا چھپا انداز، اخفائے راز کی کوئی کوشش یا ریاکاری کا کوئی عمل موجود نہیں ہوتا۔ وہ ایک نہایت بیباک اور پُر خلوص انسان ہے اور آپ سے بھی اسی بیباکی اور خلوص کا طالب ہے۔ وہ آپ کے سامنے آتے ہی آپ کے ارشاد کی تعمیل میں ایک سلسلۂ گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ اور یہ گفتگو بھی کیا ہے؟ انسانی فکر کا نچوڑ، انسانی احساسات کی لطیف ترین اور ارفع ترین صورت! ایک ایسا قیمتی سرمایہ کہ اگر یہ ہم سے چھن جائے تو زندگی بے کار، بے معنی اور تہی دامن ہو کر رہ جائے لیکن لطف یہ ہے کہ آپ کا یہ عظیم دوست محض آپ کے موڈ کے تابع ہے۔ آپ اس سے باتیں کرنے کو کہیں تو وہ گھنٹوں بے تکان آپ سے باتیں کرتا جائے۔ اور آپ جب اکتا کر اس سے چُپ ہونے کو کہیں تو بغیر کسی ملال کے چُپ ہو جائے، اور آپ کے بہتر موڈ کا انتظار کرے۔ بھلا یہ بات کتب خانے سے باہر ممکن ہے!

لیکن یہ چھوٹا سا کمرہ جس میں وقتاً فوقتاً باہر سے کتابیں ٹپکتی رہیں اور جسے میں نے "میرا کتب خانہ" کہا ہے درحقیقت میرے احساسات کی ایک داستان بھی ہے۔ اس میں ہر کتاب کبھی ایک مژدۂ جانفزا اور کبھی ایک حادثۂ جانکاہ بن کر نازل ہوئی لیکن لطف یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں نتیجہ مسرت کی صورت ہی میں ظاہر ہوا۔ مجھے مژدۂ جانفزا تو اس کتاب نے دیا جس میں میں نے اپنے ہی افکار اور نظریات کا پرتو دیکھا۔ اس سے اپنی ذات پر بڑا اعتماد حاصل ہوا اور زندہ رہنے کو جی چاہنے لگا۔ حادثۂ جانکاہ میں اس کتاب کو کہوں گا۔ جس نے میرے پہلے احساسات کو پاش پاش کر دیا اور مجھے ایک بلند تر سطح پر اپنی فکری اور احساسی دنیا کو از سرِ نو مرتب کرنے کی تحریک دی اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی کتاب ہی نے نظر کو وہ کشادگی عطا کی جو ہزاروں کوس چلنے سے بھی حاصل نہیں ہوتی۔

میرے کتب خانے میں اوّل اوّل دیوانِ غالب، شیکسپیر کے ڈرامے، انگریزی کے نیچر پرست شعراء کے مجموعے، اقبال کی کتابیں، دیوانِ حافظ، آزاد کی آبِ حیات، موپساں کے افسانے

چارلس ڈکنز، سمرسٹ ماہم، ہمینگوے، لارنس، جیمز جوائس، ورجینیا وولف ولز، پرل ایس بک
اپٹن سنکلیر وغیرہ کے ناول، نیز روسی اور فرانسیسی افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی کتب
داخل ہوئیں اور میرے احساسی نظام کی اولین سطح کو مرتب کرتی چلی گئیں۔ اسی دوران میں مذہبی
صحیفوں ــــ اور یونانی مفکروں کی کتب سے آشنا ہوا۔ گویا ذہن کی بکھری ہوئی کڑیاں بھی
مرتب ہونے لگیں۔ اور اس کے بعد یکایک میری لائبریری میں ایک ایسی کتاب داخل ہوئی
جسے میں ایک حادثۂ جانکاہ کا نام دوں گا۔ اور جس نے میرے نظامِ فکر کی نہج ہی کو بدل دیا۔ یہ
کتاب سوامی رام تیرتھ کی ان تقریروں پر مشتمل تھی جو اس نے اس صدی کے آغاز میں امریکہ کے مختلف
شہروں میں کیں اور جنہیں (IN WOODS OF GOD REALIZATION) کے نام سے مرتب کر دیا گیا تھا۔ میں
نے جب سوامی رام تیرتھ کی یہ تقاریر پڑھیں جن میں اُپنشد کے فلسفے کو بڑی صفائی اور جذبے کے ساتھ
بیان کیا گیا ہے تو میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں اور مجھے محسوس ہوا گویا میری شخصیت میں ایک
نئی سطح کا اضافہ ہو گیا ہے۔ میں نے مذہبی قیود، فرقہ پرستی بلکہ قوم اور وطن پرستی کے مدارج سے اوپر
اُٹھ کر کائنات کو ایک "اکائی" کے روپ میں دیکھنے اور انسان کو اس کائنات کا مرکزی نقطہ قرار
دینے کا نظریہ سوامی رام تیرتھ کے اس اپدیش ہی سے حاصل کیا۔ کچھ عرصہ کے لئے تو میں اس طلسم میں پتھر کی طرح بے
حس و حرکت پڑا رہا اور جب اس سے باہر آ کر رُوحانیت کے بجائے فن اور اس کے مقتضیات میں گرفتار ہوا تو بھی ویدانت کی
کشادہ دامانی نے ہمیشہ مجھے راہ دکھائی اور زندگی کی اُلجھی ہوئی راہوں میں گُم ہو جانے سے باز رکھا۔

سوامی رام تیرتھ نے مجھے مسرت کی تلاش پر مائل کیا۔ اس مسرت کا کچھ پرتو مجھے خود فراموشی
کے عالم اور ذات کو کائنات پر منطبق کرنے کے عمل میں ملا۔ لیکن جب میں آسمان سے زمین پر
اترا تو بھی تلاش کے اس جذبے نے برابر میرا ساتھ دیا۔ میں مسرت کے صرف ماورائی مدارج سے
ہی نہیں، اس کے ارضی مظاہر سے بھی آشنا ہونے کا متمنی تھا۔ انہی دنوں میرے کتب خانے
میں لن یوٹانگ کی امپارٹنس آف لونگ داخل ہوئی اور مجھے ایک انوکھے کیف سے سرشار کر
گئی۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات، حادثات، مظاہر اور پہلوؤں سے کس طرح لطف
اندوز ہونا چاہیئے۔ یوں کہ ارضی لذتیں بھی مسلط نہ ہوں اور ماورائی کیفیات پر غالب نہ آ جائیں۔ میں
نے اس کتاب ہی سے سیکھا۔ عجیب فلسفہ تھا۔ بالکل صراطِ مستقیم پر چلنے کی کیفیت! لیکن اس سے

میں نے اصل بات یہ سیکھی کہ زندگی — یہ ارضی زندگی ایک نہایت نادر اور نایاب تجربہ ہے اور اس سے منہ موڑنا کفرانِ نعمت کے مترادف ہے۔ چنانچہ میں نے بڑی باقاعدگی سے مسرت کے موضوع پر مطالعہ کا آغاز کردیا اور پھر میرے کتب خانے میں اس موضوع پر کتابوں کی ایک پوری قطار نمودار ہوگئی۔ اس میں برٹنڈ رسل اور انڈریو مارے کی مسرت کے موضوع پر کتب بھی تھیں اور ارسطو سے لے کر کروچے تک تمام اہم فلاسفروں کی وہ کتب بھی جن میں مسرت کے موضوع پر کچھ نہ کچھ لکھا گیا ہے۔ اس موضوع سے سب سے بڑا فائدہ مجھے یہ پہنچا کہ میں ایک طالب علم کی طرح فلسفے کی طرف راغب ہوا۔ اور میں نے وہ تمام کتب بھی پڑھ ڈالیں جو ایک پُر لطف۔ اعلیٰ و ارفع زندگی کا گُر سکھاتی تھیں۔ لیکن جب میں ازدواجی زندگی میں مسرت کے حصول کے مطالعہ کی طرف راغب ہوا تو یکایک قطعاً غیر ارادی طور پر نفسیات کے طویل و عریض جنگل میں داخل ہوگیا اور میرے فکر و احساس میں ایک بار پھر ایک نئی سطح کا اضافہ ہوگیا۔

نفسیات کا مطالعہ فرائڈ کے نظریات سے ہوا اور میں نے اپنے کتب خانے میں فرائڈ کی بیشتر کتب اکٹھی کرلیں۔ ان میں ورٹ پرائس کی مشہور کتاب بھی تھی۔ ٹوٹم اور ٹیبو بھی۔ خوابوں کے بارے میں اس کی کتاب بھی۔ بی یونڈ دی پلیژر پرنسپل بھی اور موسیٰ کے مرکزی کردار کو اجاگر کرنے کے سلسلہ میں اس کی آخری کتاب بھی۔ فرائڈ کے بعد میں نے ایڈلر۔ ژونگ اور اوٹو رینک کے نظریات کا مطالعہ کیا لیکن ژونگ کی کتاب نے مجھے باہر کی طرف دیکھنے کی بجائے پلٹ کر اپنی ذات کی گہرائیوں، نسل کے ثقافتی سرمائے اور دیومالا کے نفسیاتی مطالعہ پر اکسایا یہیں سے میرا وہ مطالعہ شروع ہوا جو مجھے آج بھی بے حد عزیز ہے۔ یعنی تاریخِ تہذیب! لیکن اس کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ ژونگ کی کتابوں بالخصوص سمبلز آف ٹرانسفارمیشن اور ریلیجن اینڈ سائیکالوجی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ دوسرے نفسیاتی مفکرین کی بہ نسبت ژونگ مشرق سے قریب بھی ہے اس لئے قدرتی طور پر مجھے ژونگ کے نظریات میں سکھ کا احساس ہوا۔ ژونگ دیومالا کی علامتوں اور ARCHE TYPES کا بہت ذکر کرتا ہے۔ ضروری تھا کہ میں دیومالا کا بھی کچھ مطالعہ کرتا تاکہ ژونگ کے نظریات کو گرفت میں لینا آسان ہوتا۔ یوں میرے کتب خانے میں فریزر کی گولڈن باؤ داخل ہوئی اور میں نے کئی راتیں اس کے مطالعے میں صرف کردیں۔ اس کتاب نے ذہن کو جلا بخشی اور میں اپنے سفر پر

از سرِ نو رواں ہونے کے قابل ہوگیا۔

ان ہی دنوں میرے سر میں یہ سودا سمایا کہ میں طنز و مزاح پر ایک مبسوط مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی سند کے لیے پیش کروں۔ یوں مجھے ہنسی اور اس کے اماثل پر متعدد کتابیں پڑھنے کا موقع ملا۔ اور میرے کتب خانے میں ایک تازہ موضوع کے سلسلے میں بہت سی کتابیں اکٹھی ہوگئیں۔ کانٹ شوپنہار، گریگ، الیسٹ مین، آرتھر کوسٹلر اور برگساں اسی چور دروازے سے میرے یہاں داخل ہوئے۔ ان میں سے برگساں کی کتاب CREATIVE EVOLUTION نے بڑا لطف دیا۔ دوسری کتاب آرتھر کوسٹلر کی INSIGHT-AND-OUTLOOK تھی مجھے آج بھی اس کتاب سے بڑا پیار ہے۔ اس میں آرتھر کوسٹلر نے مزاحیہ تخلیق اور المیہ کے مابین جو لطیف سا ربط قائم کیا ہے، اس نے مجھے متاثر کیا اور مجھے تخلیق کے لوازم اور مقتضیات کو سمجھنے میں مدد دی۔

اسی دوران میں قطعاً غیر شعوری طور پر میں ایک وسیع تر موضوع کی طرح راغب ہو رہا تھا۔ اس موضوع سے میری دلچسپی کا آغاز تو ان ایام ہی میں ہوگیا تھا، جب میں نے پنڈت نہرو کی سوانح عمری اور ڈسکوری آف انڈیا کا مطالعہ کیا تھا۔ اور مجھے برِ صغیر کے ماضی سے گہرا لگاؤ پیدا ہوگیا تھا۔ پھر تمدنِ ہند اور سر مارٹیمر ویلیر کی کتابوں نے بھی خاصی زمین ہموار کر دی تھی۔ اب مجھے یکایک اس بات کا احساس ہوا کہ اس برِ صغیر کی تہذیب افریشیا کی تہذیب سے الگ نہیں اور اس لیے اس کا مطالعہ افریشیا کے وسیع تر کینوس میں رکھ کر کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں ایران، عراق، مصر اور اس کے ساتھ یونان اور روم کی تہذیبوں کی طرف مائل ہوا اور میرے کتب خانے میں ایک سہانے موضوع پر متعدد کتابیں داخل ہوتی چلی گئیں۔ میں نے اس سلسلے میں براؤن اور نکلسن سے لے کر لیونارڈ کوٹرل اور مسلمان صوفیا کی کتب سے لے کر ہیگل، ٹائن بی، شپنگلر اور سوروکن تک تقریباً تمام اہم مفکرین سے استفادہ کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ہیگل کی "دی فلاسفی آف ہسٹری" شپنگلر کی "ڈیکلائن آف دی ویسٹ" اور ٹائن بی کی "انٹروڈکشن ٹو دی سٹڈی آف ہسٹری" نے میرے ذہن کے بہت سے گوشوں کو منور کر دیا۔ بالخصوص شپنگلر کی کتاب تو میرے لیے ایک "حادثۂ جانکاہ" ثابت ہوئی۔ اور اس نے مجھے ایک نئی ذہنی سطح سے آشنا کیا۔ اب میرے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ میں افریشیا کی ارضی تہذیب کے مزاج سے واقف ہو کر اس کا موازنہ — آریاؤں کی غیر ارضی تہذیب کے ساتھ کر سکتا — اس موازنہ نے

گویا انکشاف اور عرفان کے بہت سے دروازے واکردیئے اور مجھے محسوس ہونے لگا جیسے میں ایک لامحدود کائنات میں یکہ وتنہا نہیں بلکہ احساسی طور پر اپنے ماضی سے پوری طرح وابستہ ہوں۔ اس بات سے ایک میٹھی سی راحت کا احساس ہوا۔

لیکن انسان کے اندر جو مضطرب اور بے قرار ہستی چھپی بیٹھی ہے اسے اطمینان کہاں؟گویا جب انسان کسی مقررکردہ منزل کے قریب پہنچ جاتا ہے تو ایک فطری عمل کے تحت کسی دوسری منزل کے نقوش اجاگر ہوجاتے ہیں۔ میں نے تاریخ تہذیب کا مطالعہ تو کرلیا تھا لیکن ذہن بار بار یہ سوال کرتا کہ ایک خاص صورتِ حال میں انسان کیوں ایک خاص ردِّ عمل کا مظاہرہ کرتا ہے؛ اس کے ذہن کی تشکیل میں ماحول کے اثرات کس قدر ہیں اور جبلّت کے کس قدر؛ یعنی کیا انسان خارجی حالات کے سانچوں میں ڈھلتا ہے یا ان سانچوں کو وہ اپنے نسل کے گودام سے حاصل کرتا ہے ایسے متعدد سوالات ذہن میں ایک کہرام سا برپا کرنے لگے اور میں نے خود کو غیر شعوری طور پر علم الانسان کا مطالعہ کرنے کی طرف راغب پایا۔ شپنگلر اور ٹائن بی نے اس سلسلے میں خاصی زمین ہموار کردی تھی اب میں نے میتھو، ٹائیلر اور ہنٹنگٹن کی کتب کا مطالعہ کیا اور روشنی حاصل کی۔ بالخصوص ہنٹنگٹن کی کتاب "مین سپرنگ آف سولیزیشن" تو حادثۂ جانکاہ نسل کی ایک کتاب ثابت ہوئی اور میں نے اس کی روشنی میں اپنے برِّصغیر کے "تہذیبی پیکر" کا پوری طرح مطالعہ کیا اور اس قوت سے آشنا ہوا جو اس دھرتی کی ہوا، پانی اور نمک سے مرتب ہوئی ہے اور جس نے ہر بیرونی قوت کو زود یا بدیر خود میں ضم کرلیا ہے۔ اسی سلسلے میں مجھے این۔ جی بیرل کی تصنیف MAN'S EMERGING MIND اور لورین ایزلے کی کتاب THE IMMENSE JOURNEY کو دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا اور میں نے کرۂ ارض پر زندگی بالخصوص انسانی زندگی کے سفر کی ساری داستان پڑھ ڈالی۔ موخرالذکر کتاب تو میرے لئے ایک "حادثۂ جانکاہ" ثابت ہوئی اور میں اپنے سابقہ نقطۂ نظر کو مسمار کرکے ایک نئے اور کشادہ تر زاویۂ نگاہ کی تعمیر میں کامیاب ہوسکا۔

اسی دوران میں مجھے "تخلیقی عمل" کے موضوع نے اپنے گرفت میں لے لیا اور میں اس بات پر غور کرنے لگا کہ کیا ارتقا ایک میکانکی انداز میں، نپے تلے قدم اٹھانے کا نام ہے یا تخلیقی جست کی مدد سے آگے بڑھنے کے عمل سے مترادف ہے؛ یوں مجھے اس بات کی ضرورت پڑی کہ میں حیاتیات،

عمرانیات ، دیومالا ، تاریخ اور ادب کا "تخلیقی عمل" کی روشنی میں مطالعہ کروں۔ تجسس اورنگ وود کے اسی عالم میں میں نے کیسیرر کی لینگوئج اینڈ متھ اور متھ آف دی سٹیٹ کا بھی مطالعہ کیا اور سوسن لنگر کی فلاسفی اِن اے نیو کی اور کولن ولسن کی بیونڈ دی آؤٹ سائڈر بھی پڑھ ڈالی۔ ان تینوں مصنفین کی کتابوں نے مجھے احساس اور عرفان کے ایک نئے ہی عالم میں پہنچا دیا۔

مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اس تمام عرصے میں ادب اور اس کی تحریکات سے ناآشنا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ ادب تو میرا محبوب ترین موضوع تھا اور میں اسے پوری طرح سمجھنے اور اس سے محظوظ ہونے کے لئے اس کے گرد چکر لگاتا اور ان علوم سے آشنا ہونے کی کوشش کرتا رہا جو اس سے کسی نہ کسی حد تک متعلق تھے چنانچہ میں نے تاریخِ تہذیب اور علم الانسان کے علاوہ فلسفے بالخصوص "موجودیت" کا مطالعہ بھی اسی سلسلے میں کیا اور فلکیات، موسیقی اور رقص کا بھی۔ اس کے علاوہ نطشے اور ہائیڈگر سے لے کر ہربرٹ ریڈ، کینتھ برک، کروچے، ایلیٹ۔ سیورج۔ رچرڈس، سارتر، اور آرتھر کوئسلر کو خاص طور پر اس لئے پڑھا کہ میں ادب اور اس کے مقتضیات کو سمجھنے کا متمنی تھا چنانچہ ان مصنفین کی بہت سی کتب بھی میرے کتب خانے میں داخل ہوتی چلی گئیں۔

مطالعہ کی کہانی بہت طویل ہے اور اس کے ذکر سے میں قاری کی اکتاہٹ کو تحریک دینے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ کتاب تو ایک بحرِ ذخار ہے۔ آپ عمر بھر اس کا مطالعہ کیجیے مگر آخر میں آپ کو محسوس ہوگا جیسے آپ نے ابھی اس سمندر کے ساحل پہ ہی چہل قدمی کی ہے۔ یہی حال میرا ہے۔ میں نے بہت سی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں لیکن محسوس یہی ہوتا ہے جیسے ابھی کچھ نہیں پڑھا۔

کتابوں کی معیت میں

جہاز کا خطرے کا سائرن چیخ اٹھا ہے اور سائرن کی آواز کے ساتھ ہی پورے جہاز میں افراتفری مچ گئی ہے۔ جہاز کے کپتان سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔ اس لئے اس نے مجھے ایک لائف بوٹ مہیا کر دی ہے تاکہ میں کسی قریبی جزیرے میں پناہ لے سکوں مگر اس نے مجھے اپنے ساتھ جہاز کی لائبریری سے صرف تین کتابیں لے جانے کی اجازت دی ہے۔ سوال یہ ہے کہ میں کون سی کتابیں اپنے ساتھ لے جاؤں اور پھر بتاؤں کہ میں نے ایسا کیوں کیا؟۔ وقت تنگ ہے اور مجھے فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنا ہے۔ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے کہا جائے کہ میں اپنے بچوں میں سے کسی ایک کو اپنے ساتھ لے جاؤں اور باقی کو جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں غرق ہونے کے لئے چھوڑ دوں ایسی صورت میں میرا ردِ عمل تو یہ ہوگا کہ اپنی بجائے اپنے بچوں کو لائف بوٹ میں سوار کر دوں اور خود ڈوب جاؤں۔ یہی صورت کتابوں کی ہے۔ اگر یہ کتابیں انتہائی نادر و نایاب صحیفے ہوتے تو میں انہیں لائف بوٹ میں بھر کر جزیرے کی طرف بہا دیتا اور خود جہاز کے ساتھ ہی سمندر کی تہ میں اُتر جاتا۔ مگر چونکہ ان کتابوں کی لاکھوں جلدیں پہلے ہی دنیا میں بکھری پڑی ہیں۔ اسی لئے ظاہر ہے کہ سوال کتاب کی بقا کا نہیں، میری اپنی بقا کا ہے۔ نجانے مجھے جزیرے میں کتنا عرصہ گزارنا پڑے سنا ہے بعض مسافروں کو سال ہا سال ایک ہی چھوٹے سے جزیرے میں یکہ و تنہا زندگی بسر کرنا پڑی ہے وہاں انہیں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لئے غذا تو کافی مقدار میں ملی اور دیکھنے کو مناظر بھی میسر آئے لیکن تنہائی اور بوریت کے احساس نے انہیں کچل کر رکھ دیا۔ اس بوریت ہی کا مقابلہ کرنے کے لئے جہاز کے جہاندیدہ کپتان نے مجھے اپنے ساتھ تین کتابیں لے جانے کا مشورہ دیا ہے۔ میں

سوچتا ہوں کہ کتاب تو دوست کی طرح ہے ۔ اگر دوست کم آمیز اور اس کی شخصیت اکہری ہے تو میں چند ہی دنوں بلکہ چند ہی ساعتوں میں اس سے اُکتا سکتا ہوں ۔ اسی طرح میں ہر اس کتاب سے اُکتا سکتا ہوں جو مجھے سوچ کی غذا مہیا نہ کر سکے ۔ اور جس کے مطالعہ سے مجھے ہر بار نت نئے ابعاد کا احساس نہ ہو ۔ نہ جانے مجھے اپنے طویل قیام میں ان تینوں کتابوں کو کتنی بار پڑھنا ہوگا ۔ اور یہ نہ ہو کہ دوسری ہی بار کے مطالعہ سے میں ان سے اُکتا جاؤں اور انہیں پورے زور کے ساتھ سمندر میں پھینک دوں ۔ کتابیں کئی قسم کی ہیں ۔ بعض ایک بار کے مطالعہ کے بعد ہی باسی ہو جاتی ہیں ۔ بعض سو بار مطالعہ کرنے کے بعد بھی تازہ محسوس ہوتی ہیں ۔ سائرن دوسری بار چیخا ہے اور جہاز سربسجود ہونے لگا ہے وقت کچھ اور بھی تنگ ہے ۔ میں نے یکے بعد دیگرے کئی کتابوں کو اٹھایا ہے اور پھر سر کو انکار میں ہلاتے ہوئے انہیں ایک طرف رکھ دیا ہے ۔ معاً میری نظر لورین ایزلے (LOREN EISLEY) کی کتاب (THE IMMENSE JOURNEY) پر پڑی ہے اور میں نے جلدی سے یہ کتاب اٹھالی ہے ۔ میں دوبارہ کتابوں کو الٹنے پلٹنے لگا ہوں ۔ ایک چھوٹی سی کتاب شیلف میں سے پھدک کر زمین پر آگری ہے ۔ میں نے کتاب کو اٹھا کر دیکھا ہے ۔ یہ نطشے کی "THUS SPAKE ZARATHUSTRA" ہے ۔ میں نے خوش ہو کر یہ کتاب بھی اپنے تھیلے میں ڈال لی ہے ۔ اب مجھے ایک فقط ایک کتاب اور چاہیے ۔ شیلف میں سے میر، غالب، میرا جی، فیض اور ان کے مقلدین مجھے گھورنے لگے ہیں ۔ مگر میں ان سے نظریں ملانا نہیں چاہتا ۔ ییٹس، کیٹس اور ایلیٹ نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی ہے مگر فی الحال مجھے ان کی بھی ضرورت نہیں ۔ ملارمے ۔ سیفو ۔ ملٹن، میرا بائی اور وارث شاہ ۔ نہیں، مجھے تو ایک ایسی کتاب چاہیے جس میں سمندر کی سی وسعت، جنگل کی سی بوقلمونی اور شہر کی سی ہما ہمی ہو ۔ معاً میری نظر وہٹ مین (WHITMAN) کی کتاب LEAVES OF GRASS پر پڑتی ہے اور میں اس کتاب کو بھی اپنے تھیلے میں ڈال لیتا ہوں ۔ اب جہاز کچھ اور بھی جھک گیا ہے ۔ میں اپنی لائف بوٹ میں آ جاتا ہوں اور جہاز سے دُور ہونے لگتا ہوں ۔ پھر میں فاصلے سے دیکھتا ہوں کہ عرشۂ جہاز پر جہاز کا کپتان ایک سنگِ میل کی طرح ایستادہ ہے اور لحظہ بہ لحظہ جہاز کے ساتھ ہی سمندر میں اترتا جا رہا ہے ۔ مگر میں اپنے جسم کی لائف بوٹ میں محفوظ تین انوکھی کتابوں کو سینے سے لگائے ایک بالکل نئی "DIMENSION" میں آ گیا ہوں ۔ اور اب اس قابل ہوں کہ جزیرے میں رہوں اور

اس بوریت کو اپنے قریب بھی نہ آنے دوں جو جزیرے کے ہر مسافر کا نوشتۂ تقدیر ہے۔

اور اب کہ میں جزیرے میں پہنچ گیا ہوں تو میں آپ کو بتا سکتا ہوں کہ میں نے سینکڑوں کتابوں میں سے ان تین کتابوں کا انتخاب کیوں کیا۔ ان میں سے دو کتابیں تو بالکل مختصر سی ہیں مگر تیسری کتاب قدرے بڑی ہے۔ تاہم اس اعتبار سے یہ تینوں کتابیں بڑی ہیں کہ انہیں صفحوں کے حساب سے نہیں بلکہ فقروں، مصرعوں یا لفظوں کے حساب سے پڑھنا چاہیئے۔ میں ان کتابوں کے لئے انگریزی محاورہ PACKED WITH WISDOM استعمال کرنا نہیں چاہتا کیوں کہ جزیرے میں رہتے ہوئے آپ WISDOM سے بھی اُکتا سکتے ہیں۔ ان کتابوں کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر قدم پر آپ کو ٹھہرا لیتی ہیں اور پھر سوچ کو مہمیز لگا کر آپ کو کسی اور ہی دنیا میں لے جاتی ہیں۔

میں نے سب سے پہلے لورین ایزلے کی کتاب (THE IMMENSE JOURNEY) کو اپنے ہاتھ لیا ہے اور معاً میں جزیرے کی فضا کو عبور کرکے ماضی اور مستقبل میں دُور دُور تک گھومنے لگا ہوں کئی منٹ تو میں اس کتاب کے عنوان ہی کو بار بار پڑھتا چلا گیا ہوں۔ عظیم سفر THE IMMENSE JOURNEY لیکن کیسا سفر؟ یہ کوئی مہماتی کہانی نہیں جو خزانے کی تلاش سے متعلق ہو۔ یہ تو کہانی ہے زندگی کے سفر کی جو قرنوں پہلے شروع ہوا اور قرنوں بعد ختم ہوگا۔ لورین ایزلے ایک سائنس دان ہے۔ لیکن وہ سائنسدان بننے سے پہلے ایک شاعر تھا۔ سائنس دان عملی آدمی ہوتا ہے وہ حقائق کی روشنی میں ہر شے کا تجزیہ کرتا ہے اور پھر کسی اور مسئلہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے لیکن جب شاعر پر کوئی بات منکشف ہوتی ہے تو اس کا تخیل برانگیختہ ہو جاتا ہے۔ یہی اس کتاب کا امتیازی وصف ہے کہ اس میں ایک شاعر نے سائنس دان کا روپ دھار کر درشن دیا ہے یا اصل بات یہ ہے کہ ایک سائنس دان نے شاعر کے تخیل کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی بیوی کی موت پر کچھ اس طرح کے تاثر کا اظہار کیا تھا کہ میں نجانے کب سے ایک شاہراہ پر اکیلا چلا جا رہا تھا کہ وہ ایک پگڈنڈی پر سے کُود کر شاہراہ پر آگئی اور میرا ہاتھ تھام کر میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ وہ چلتی گئی چلتی گئی اور پھر ایک جگہ اس نے آہستہ سے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور شاہراہ سے پھوٹنے والی ایک اور گرد آلود پگڈنڈی پر مُڑ گئی۔ مگر میں آگے ہی آگے چلتا رہا؛ لورین ایزلے نے زندگی کے سفر کو بھی کچھ ایسے ہی دیکھا ہے زندگی سمندر سے برآمد ہوئی اور پھر نباتات، حیوانات اور پرندوں کی صورت میں مصروفِ سفر ہوئی

اور لاکھوں کروڑوں برس تک کروٹ پر کروٹ لیتی چلی گئی مگر پھر آج سے محض چند لاکھ سال پہلے انسان بھی اس کارواں میں شامل ہو گیا۔ زندگی کا سفر جاری ہے کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ انسان کب اس کارواں سے کٹ کر دوبارہ اس تاریکی میں چلا جائے جہاں سے وہ برآمد ہوا تھا اور زندگی شادیانے بجاتی ہوئی آگے ہی آگے کو بڑھتی چلی جائے۔ لورین ایزلے لکھتا ہے کہ جب میں صبح کے جھٹپٹے میں بیدار ہوتا ہوں اور نیویارک کی کسی بلند و بالا عمارت پر سے پرندوں کی چہکار کو سنتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ پرندے ایک دوسرے سے پوچھ رہے ہیں۔ "کیا وہ (انسان) ابھی گیا نہیں؟" میں لورین ایزلے کے اس ایک فقرے پر گھنٹوں سر دھن سکتا ہوں۔ انسان کو اس دنیا میں وارد ہوئے ابھی عرصہ ہی کتنا گزرا ہے لہٰذا وہ یہاں کے چرند پرند کے لئے قطعاً اجنبی اور غیر ارضی ہے تاہم اس نے زندگی کے لاتعداد دوسرے نمائندوں کو اپنا مطیع کر لیا ہے اور اب یہ نمائندے اس اجنبی تسلط سے اُکتا کر سوچتے ہیں کہ نجانے وہ کب دفع ہو گا؟ میں سوچنے لگا ہوں کہ یہ کرۂ ارض کروڑوں برس تک زندگی کے بغیر ہی خلا میں گھومتا رہا۔ پھر کروڑوں برس ہوئے اس پر زندگی نے اپنا گھونسلا بنایا (سائنس دان اس واقعہ کو اپنی بے رحم حقیقت نگاری کے تحت یوں بیان کرتے ہیں کہ لامحدود کائنات میں آوارہ پھرتے ہوئے اس کنکر پر جسے ہم زمین کہتے ہیں زندگی کا FUNGUS سا لگ گیا) ابھی صرف چند سال ہوئے کہ انسان پیدا ہوا۔ آنے والے زمانے میں یہ اجنبی شاید سب سے پہلے رخصت ہو گا، پھر چرند پرند جائیں گے، پھر حشرات الارض، پھر نباتات اور زمین دوبارہ کسی اندھی گونگی اور ٹھنڈی شے کی طرح خلا میں کروڑوں اربوں برس تک گھومتی چلی جائے گی۔ لورین ایزلے پوچھتا ہے: یہ "زندگی" کہاں سے آئی؟ کیونکہ جب اس کے عناصر ترکیبی کو الگ الگ کر کے دیکھیں تو بظاہر ان میں کوئی راز نظر نہیں آتا۔ مگر محض ان عناصر کو ایک جگہ ڈھیر کر دینے سے زندگی پیدا بھی تو نہیں ہوتی۔ مختصر ترین سیل CELL میں بھی کم و بیش تین لاکھ PROTEN MOLECULES ہیں جو ایک خاص ترتیب سے منسلک اور مربوط ہوں تو زندگی پیدا ہوتی ہے یہ ترتیب کیا ہے؟ اس ترتیب کا محرکِ اعظم کون ہے؟ کیا مادہ اور اس کا سارا پُراسرار نظام اور اس کے جملہ حیرت انگیز مظاہر، جھینگر اور چڑیاں اور آوارہ پھرتے ہوئے انسان بجائے خود کسی انوکھی قوت کے چہرے کے مختلف نقاب نہیں ہیں۔ میں نے ایزلے کی کتاب لحظہ بھر کے لئے بند کر دی ہے اور سوچنے لگا ہوں کہ کیا زندگی محض اس کرۂ ارض تک محدود ہے؟

ہرگز نہیں! کائنات میں لاکھوں کروڑوں کہکشائیں موجود ہیں۔ ہر کہکشاں میں لاکھوں ستارے ہیں اور ہر ستارے کے گرد ایک خاص تعداد میں سیارے ہیں۔ ان سیاروں میں سے کسی بھی سیارے پر زندگی کی نمو ممکن ہے مگر چونکہ زندگی کا امتیازی وصف تنوع اور بوقلمونی ہے اس لئے کہیں یہ تو نہیں کہ کائنات میں زندگی کے لاکھوں کروڑوں روپ تو ہوں لیکن انسانی روپ کہیں اور موجود نہ ہو تو پھر کیا ہم اس بھری کائنات میں اکیلے ہیں ؟ ۔ معاً مجھے جزیرے میں اپنی تنہائی بے معنی نظر آنے لگی ہے۔ کیونکہ اب، مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ انسان تو بھری کائنات میں تنہا ہے۔

میں نے کتاب دوبارہ کھول لی ہے اور اس کی ورق گردانی کرنے لگا ہوں۔ معاً میری نظریں لورین ایزلے کے اس فقرے پر رک جاتی ہیں۔

THE CLOCK IN THE BODY, IN OTHER WORDS, HAS PLACED A LIMIT UPON THE PACE AT WHICH THE APE BRAIN GROWS—A LIMIT WHICH THE HUMAN ANCESTORS IN SOME MANNAR ESCAPED.

اور یہ فقرہ میرے ذہن میں ایک ہیجان سا برپا کر دیتا ہے۔ زندگی کے ہر مظہر کے اندر اس کی ایک اپنی گھڑی (کلاک) موجود ہے جو ایک مقررہ رفتار سے ٹِک ٹِک کرتی چلی جاتی ہے۔ ہر مظہر اپنی کلاک کی ٹِک ٹِک کا اسیر ہے۔ انسان صرف اس لئے انسان ہے کہ ارتقا کے کسی موڑ پر اس نے APE کی کلاک کے زندان سے جست بھری اور ایک نئی کلاک کے زندان میں آگیا۔ اسی لئے (MISSING LINK) کی تلاش بے سود ہے۔ انسانی دماغ کی نمو آہستہ آہستہ بتدریج نہیں بلکہ ایک جست کے ذریعہ ہوئی۔ کئی برس ہوئے میں نے ایک کتاب لکھی تھی۔ "تخلیقی عمل"! اس میں ایک بنیادی نکتہ یہ تھا کہ تخلیق کا عمل ایک پُر اسرار سی جست کے تابع ہے اور یہ جست جسم، معاشرہ، تاریخ دیومالا، فن، بلکہ ساری کائنات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ آج جب میں نے ایزلے کی کتاب کو دوبارہ ہاتھ میں لیا تو مجھے اس جست کا ایک سائنسی ثبوت بھی مل گیا۔ مگر اس کتاب سے مجھے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ملا ہے۔ مثلاً یہ خیال کہ حیوان کے اندر کی گھڑی انسان کی گھڑی سے مختلف ہے اور انسان اور حیوان کی گھڑیاں نباتات کی گھڑی سے مختلف ہیں۔ جو گھڑی آہستہ آہستہ چلتی ہے وہ زیادہ

دیر تک چلتی ہے اور جو زیادہ تیز چلتی ہے وہ جلد ہی اپنے انجام کو پہنچ کر رُک جاتی ہے۔ اب کھُلا کہ پرانے زمانے میں عمریں کیوں لمبی ہوتی تھیں کہ اُن دنوں انسانی معاشرے کے کلاک کی رفتار وہ نہیں تھی جو بیسویں صدی میں ہو گئی ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ میری زمین کی گھڑی بھی تو دوسرے سیاروں کی گھڑیوں سے مختلف ہے اور اسی لئے میری زمین کے وقت کا پیمانہ بھی دوسرے سیاروں کے وقت کے پیمانوں سے مختلف ہے۔ پھر میری کہکشاں کی گھڑی ہے جس کی رفتار دوسری کہکشاؤں سے مختلف ہے۔ میں کس قسم کی کائنات کا باسی ہوں؟ اوپر دیکھوں تو وقت کی پرتیں تا حدِ خیال پھیلی ہیں اور یہ وقت سُست سے سُست تر ہوتا چلا گیا ہے (جیسے مثلاً ایک ستارے کا عرصۂ حیات جو کروڑوں روشنی کے سالوں پر محیط ہے)۔ نیچے دیکھوں تو بھی وقت کی پرتیں تا حدِ خیال ہیں مگر یہ وقت تیز سے تیز تر ہو رہا ہے (جیسے مثلاً وائرس VIRUS کی عمرِ طبعی جو پلک جھپکنے میں ختم ہو جاتی ہے)، میں خود وقت کی لاتعداد پرتوں میں سے صرف ایک پرت کا باسی ہوں۔ یہ کیسا زندان ہے؟ وقت کی لاکھوں منزلہ عمارت کی صرف ایک منزل میں رہنا، وہیں پیدا ہونا اور وہیں عمرِ عزیز ایک خاص رفتار کی گھڑی کے تحت گزار کر چُکنے سے رخصت ہو جانا! لورین ایزلے کی کتاب کا یہ کرشمہ ہے کہ اس کے ایک ہی فقرے نے میرے ذہن میں اتنا بڑا ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ میں نے اسی لئے یہ کتاب چُنی تھی کہ میں اس کی معیت میں ساری عمر گزار سکتا ہوں۔

جزیرے میں یکہ و تنہا زندگی بسر کرنا صدیوں پرانے بن باس ہی کی ایک صورت ہے۔ جب میں نے جہاز کو چھوڑا تو گوتم سدھیارتھ کی طرح گویا کپل وستو کو الوداع کہی اور بن باس اختیار کیا۔ میں اپنے اس گھر میں بہت محفوظ تھا۔ اس لئے کہ میری ذات معاشرے سے پوری طرح جڑی ہوئی تھی۔ اور میرے لئے سخت سے سخت سمندری ہچکولوں میں بھی جہاز سے نیچے گرنے کا کوئی خطرہ نہ تھا لیکن جب میں نے جہاز کو چھوڑا تو گویا اپنے معاشرے اور اس کے پُرپیچ دھاگوں سے کٹ کر یکایک بالکل اکیلا ہو گیا۔ پہلے تو مجھے بڑا خوف محسوس ہوا کیوں کہ میں اب بھری کائنات میں تنہا تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ میرے اندر یہ احساس جاگا کہ میں نے اپنے شانوں پر معاشرے کا کتنا بڑا بوجھ اٹھا رکھا تھا، اور میری شخصیت کس طرح اس بوجھ تلے پس کر رہ گئی تھی۔ شاید اسی لئے حساس اذہان خود کو پہچاننے کے لئے ہمیشہ شہر کو چھوڑ کر غاروں، صحراؤں اور پہاڑوں کی طرف بھاگتے رہے ہیں۔ وجہ یہ کہ شہر اور اس کی مخلوق

فرد کا گلا گھونٹ دیتی ہے۔ معاشرہ نہیں چاہتا کہ کوئی بھیڑ اُس کے گلّے سے الگ ہوکر بھٹک جائے اسی لیئے وہ اخلاقی ضوابط، سماجی قوانین، روایت اور اصول اور قاعدہ اور ڈسپلن کی ڈور سے اُسے اس طور جکڑ لیتا ہے کہ وہ پھر کبھی اس جال سے باہر نہیں جا سکتا۔ مگر اس سارے حزم و احتیاط کے باوجود وہ اُن لوگوں کو نہیں روک سکا جو اُسے خیر باد کہہ کر بار بار جزیروں اور پہاڑوں اور صحراؤں کی طرف جاتے رہے ہیں۔ نطشے انہیں لوگوں میں سے ایک تھا۔ اس کا جزیرہ سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا جہاں اس نے اہرامِ مصر ایسی ایک بلند و بالا چٹان کے پاس بیٹھ کر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا۔ "انسان اور وقت سے چھ ہزار فٹ دُور"۔ اور پھر تنہائی اور آزادی کے اس مقدس لمحے میں اپنی ذات سے پہلی بار متعارف ہوا۔ اُس نے ذات کے اس نئے رُوپ کو زرتشت کا نام دیا۔ اور اس کے ہونٹوں سے ٹپکتے ہوئے ہر لفظ کو اپنی کتاب — THUS SPAKE ZARATHUSTRA میں محفوظ کرتا چلا گیا۔ آج یہ کتاب میرے ہاتھ میں ہے اور میں انبوہ کی کلبلاہٹ سے دُور اپنی ہی ذات کی معیت میں بیٹھا اس کا دلجمعی سے مطالعہ کر سکتا ہوں۔

نطشے نے جب یہ کتاب لکھی تو وہ جانتا تھا کہ یہ ایک شاہکار ہے مگر زمانے نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ وجہ یہ کہ اُس وقت تک زمانہ گلّے کا فلسفہ PHILOSOPHY OF THE HERD کے تابع ہو چکا تھا مگر اس کے بعد بھی مشین اور مشینی نظریات اور انسانی ہمہ اوست کے فلسفے کے رواج نے اس کی پذیرائی کو تا دیر ملتوی کیئے رکھا۔ پھر پہلی جنگِ عظیم لڑی گئی جس کے بعد سب سے پہلے یورپی ممالک اور ان کے بعد انگریزی دان طبقات آہستہ آہستہ اس کی اہمیت کے معترف ہونے لگے۔ حتیٰ کہ عیسائی پادری اور انگریز محبِ وطن بھی دبی زبان میں اس کی تعریف کرنے لگے۔ بدقسمتی اس کتاب کی یہ تھی کہ بعض حلقوں نے اسے پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کا واحد محرک قرار دے ڈالا۔ حالانکہ بقول آسکر لیوی یہ جنگیں نسلی تفاخر کے جذبے کے تابع اور KINGDOM OF HEAVEN کے حصول کی اس کوشش کا اعلامیہ تھیں جو یہودی ذہن کی عطا تھا۔ وہ یہودی ذہن جس کی تفسیر کانٹ، ہیگل اور فشٹے کے نظریات میں ملتی ہے نہ کہ نطشے کے افکار میں یہودی ذہن بھیڑ چال کے فلسفے کا قائل ہے اور خودی کے اس جوہر سے صرفِ نظر کرتا ہے جو فرد کو انبوہ سے اُوپر

اٹھا کر ایک اعلیٰ و ارفع منصب پر فائز کر دیتا ہے۔ کانٹ نے اس خودی کا گلا گھونٹنے کی ترغیب دی۔ اس نے جرمن ذہن کو شخصی مسرت کے تصور سے الگ کر کے بادشاہ اور ملک، معاشرے اور ہمسائے کی خاطر متحرک ہونے پر اکسایا۔ فشٹے نے جرمن قوم کا یہ مقدس فریضہ قرار دیا کہ وہ انسانیت کو لازمی طور پر روح کی ایک بنیاد مہیا کرے۔ اسی طرح ہیگل نے MORAL IDEA پر زور دیا اور DIVINE STATE کا وہ تصور پیش کیا جسے بسمارک نے حقیقت میں تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے KINGDOM OF HEAVEN کو زمین پر لانے کی دھن میں فرد کی انفرادیت کو اداروں کی اجتماعیت کے تابع کر دیا جب کہ نطشے نے اس استحصال کے خلاف علم بلند کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ اجتماعی زنگ آلودگی کا نہیں انفرادی تازگی کا داعی ہے۔

نطشے اکثریت کا نہیں اقلیت کا قائل ہے۔ گلے کا نہیں گلے بان کا والہ و شیدا ہے۔ اور وہ بنی نوع انسان کو نہیں بلکہ مردِ مومن کو اپنی منزل قرار دیتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کا یہ نظریہ آمریت کی طرف ایک قدم تھا بلکہ اس نے تو فرد کو اجتماع کی اس اکثریت سے بچانے کی کوشش کی جس نے یورپ کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا۔ ارتقاء غزال کی طرح چوکڑیاں بھرنے کا نام ہے نہ کہ بھیڑ کی طرح نپے تُلے قدم اٹھانے کا اور یہ چوکڑی ہمیشہ کوئی ایسا مردِ قلندر بھرتا ہے جو بہر اعتبار اپنی نوع سے افضل ہوتا ہے۔ یوں دیکھئے تو نطشے نہ محض BRUTE FORCE کا علم بردار ہے اور نہ وہ مردم بیزاری کا مرتکب ہوتا ہے۔ وہ تو پرانے زنگ آلود جہان کو ایک دھماکے کے ساتھ اڑانے اور اس کے بعد TRANSVALUATION OF VALUES کی مدد سے ایک ایسے جہانِ نو کو وجود میں لانے کا داعی ہے، جس میں خیر و شر کی جملہ سابقہ توضیحات ختم ہو جائیں گی اور ایک نئی اخلاقیات کا سورج طلوع ہوگا۔

نطشے کی یہ کتاب ایک نئی بائیبل ہے جو دنیا کو عطا ہوئی نہ صرف اس کا اسٹائل قدیم عہد نامہ کی یاد دلاتا ہے بلکہ اس کا متن بھی ایک پیغمبر کے سے فرمودات کا اظہار ہے۔ مگر ایک ایسا پیغمبر جو پیغمبروں کی صف سے بالکل الگ تھلگ کھڑا ہے، اخناتن، تاریخ کا پہلا فرد تھا۔ نطشے دوسرا فرد ہے اور جس طرح اخناتن نے اپنے زمانے سے انحراف کیا بالکل اسی طرح نطشے نے بھی کیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کام کے لئے دونوں نے ایک شعری پیرایۂ بیان کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔

جزیرے میں رہتے ہوئے مجھے یہ احساس بار بار کچوکے لگاتا ہے کہ میں ساری دنیا سے کٹ گیا ہوں ایسے میں یہ کتاب مجھے اتنا اونچا اٹھا لیتی ہے کہ سمندر کے اُس پار کی زمینیں تک میری نگاہ کی دسترس میں آجاتی ہے اور مجھے سارا معاشرہ اپنے قدموں میں کلبلاتا ہوا دکھائی دینے لگتا ہے۔ تنہائی کا مقابلہ کرنے کا ایک یہ بھی طریق ہے۔ اور یہ طریق مجھے نطشے کی اس کتاب ہی سے ملا ہے۔ تجدیدِ ملاقات کے لئے میں کتاب کی ورق گردانی کرتا ہوں اور میری نظریں ان الفاظ پر آکر رُک جاتی ہیں:

اور وہ بھی ہیں
جو بھاری قدموں کے ساتھ چلتے ہیں
اُن چھکڑوں کی طرح
جو پتھروں سے لدے ہوئے نشیب کی طرف لڑھک رہے ہوں۔
یہ لوگ زور شور سے عزت اور تمکنت اور اچھائی کی باتیں کرتے ہیں۔
اور اپنے (پتھریلے) بوجھ کو خیر کا نام دیتے ہیں
اور وہ بھی ہیں
جو چاہتے ہیں کہ انہیں آسمان پر چڑھا دیا جائے
اور وہ اسے خیر کا نام دیں
اور وہ بھی ہیں
جو چاہتے ہیں کہ انہیں پاتال میں گرا دیا جائے
اور وہ اس بات کو بھی خیر ہی کہہ کر پکاریں

نطشے کے سامنے سارا انسانی معاشرہ اور اس کی اخلاقیات پیاز کی طرح ہے جس کی پرتوں کو وہ ایک ایک کرکے اتارتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ آخر میں اُسے صدف کے اندر کا موتی ملے گا۔ بلکہ شاید یہ بتانے کے لئے کہ پیاز پرتوں اور نقابوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ جزیرے میں رہتے ہوئے پرتوں کے اُترنے کا منظر مجھے ایک عجیب سی روحانی بالیدگی عطا کرتا ہے۔ یُوں لگتا ہے جیسے میں زندگی کو پہلی بار اس کی اصل صورت میں دیکھ رہا ہوں۔

میں نے کتاب کی مزید ورق گردانی کی ہے اور کہیں کہیں سے کوئی حصّہ پڑھتا ہوں:

جب سے انسانیت وجود میں آئی ہے
انسان نے بہت کم مسرت کو چکھا ہے
بھائیو! یہی تو ہمارا پہلا گناہ ہے
لوگوں کے درمیان رہنا مشکل ہے
اس لئے کہ چپ رہنا مشکل ہے

ہم دونوں ایک بڑے دروازے میں رُک گئے
میں نے کہا — "بونے، اس دروازے کو دیکھ کہ اس کے دو چہرے ہیں
یہاں دو سڑکیں آکر ملتی ہیں
یہ پیچھے کی طرف جاتی ہوئی سڑک جو ازل تک چلی گئی ہے
اور وہ آگے کو بڑھتی ہوئی سڑک جو ابد تک جاتی ہے
یہ سڑکیں ایک دوسری کی "نفی" ہیں
مگر وہ اس دروازے پر یکجا ہو گئی ہیں
اور دروازے کی پیشانی پر لکھا ہے — "لمحۂ حال"
بونے! کیا ہم ان سڑکوں پر آگے ہی آگے بڑھتے جائیں؟
کیا سڑکیں اسی طرح ازلی و ابدی طور پہ رواں ہیں؟
اور بونے نے تحقیر کے ساتھ کہا
"ہر سیدھی شے جھوٹ ہے
ہر سچائی مڑی ہوئی ہے
وقت بجائے خود ایک دائرہ ہے۔"

میرے لئے اس کتاب کا ہر فقرہ ایک جہانِ معنی کا صدر دروازہ ہے۔ میں اس صدر دروازے میں سے اندر کی کائنات کی ایک جھلک پاتا ہوں اور پھر اس تجلی کی تاب نہ لاکر گھنٹوں ایک دائرہ نور میں گرفتار رہتا ہوں۔ یوں وقت گزرتا چلا جاتا ہے۔

ابتداً یہ زمین بالکل بنجر تھی۔ ایک طرف پانی کا بیابان تھا۔ دوسری طرف خشکی کا بیابان! پھر پانی کے بیابان میں زندگی کی کلبلاہٹ سی ہوئی اور وہ کروڑوں برس تک اپنے اس INCUBATOR میں پلتی پھولتی چلی گئی۔ تب ایک روز زندگی نے پانی کے شفاف گھونگھٹ کو اپنے چہرے سے ہٹایا تو اُسے خشکی کا بیابان دکھائی دیا اور وہ ایک چور کی طرح اس پر دبے پاؤں رینگنے لگی۔ یہ سلسلہ بھی لاکھوں برس جاری رہا۔ پھر یکایک نجانے کیا ہوا کہ کسی نے صورِ اسرافیل پھونکا اور بنجر بے رنگ زمین پر گھاس کی سبز چادر بچھ گئی اور انگنت رنگوں کے پھول ساری زمین کو ڈھانپنے لگے۔ پھر گھاس کی اس چادر پر انسان کے جدِ امجد نے ڈرتے ڈرتے اپنا پہلا قدم رکھا اور اس گھاس ہی کے ایک خوشے سے کچھ بیج نکال کر کھائے یوں اُس نے بصارت بھی حاصل کی اور بصیرت بھی۔ وہ دن اور آج کا دن، گھاس اور انسان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ انسانی معاشرہ بھی گھاس ہی کی طرح ہے۔ ذرا نم ہو تو یہ پھول اور پتیاں اس فراوانی سے نکالتا ہے کہ مالتھس کی روح بھی کانپ اٹھتی ہے۔ پھر گھاس کا ایک اور وصف یہ ہے کہ اگر آپ اس پر درانتی چلائیں یا ویسے ہی اپنے ڈھور ڈنگروں کی خدمات سے فائدہ اٹھا کر اسے صاف کر دیں تو ایک معین عرصہ کے بعد یہ دوبارہ زمین کے اندر سے برآمد ہو جاتی ہے۔ یہی حال انسانی معاشرے کا ہے۔ موت کی درانتی ایک پوری نسل پر چل جاتی ہے تو ایک نئی نسل کی سبز پتیاں باہر نکل کر ساری زمین کو دوبارہ ڈھانپ لیتی اور معاشرے کو ایک بار پھر سرسبز کر دیتی ہیں۔ والٹ وہٹ مین انہی سرسبز پتیوں کا شاعر تھا۔ اس نے نسلوں اور موسموں کی آمد و رفت کو دیکھا۔ حدِ نظر تک پھیلی ہوئی زمین اور حدِ خیال تک پھیلی ہوئی ستاروں کی گزرگاہ کو دیکھا اور اس کے احساس کے افق پر خدا، انسان، اور فطرت کی تثلیث ابھر آئی مگر اس نے ان تینوں کو اس طور مربوط کر دیا کہ ساری کائنات اکائی میں ڈھل گئی۔ یہ کام ایک ایسا حساس شخص ہی کر سکتا تھا جس نے ایک وسیع و کشادہ فضا اور ایک محفوظ معاشرے میں جنم لیا ہو۔ مثل مشہور ہے کہ ہر انگریز ایک جزیرہ ہے اور ہر امریکی ایک برِ اعظم! بات کچھ ایسی غلط بھی نہیں۔ انگریز اس لئے ایک جزیرہ ہے کہ وہ کٹا ہوا، الگ تھلگ اور کم آمیز ہے اس قدر کہ ٹرین میں سفر کرتے ہوئے بھی وہ اپنے اور دوسرے مسافروں کے درمیان اخبار کی ایک کھڑکھڑاتی ہوئی دیوار کھڑی کر لیتا ہے اور بڑی مشکل سے گفتگو پر آمادہ ہوتا ہے۔ اس نے اپنی سماجی زندگی میں بھی قانون اور قاعدہ، روایت اور رسم و رواج کے متعدد حصار قائم کر رکھے ہیں جو اسے بیرونی اثرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ جب کہ امریکی مزاجاً ایک برِ اعظم کی طرح انجمن آرا اور گپ شپ

کار سیا ہے۔ اپنی اس عادت کے باعث وہ اکثر ہدف طنز بھی بنا ہے لیکن اس کے باوجود کم گوئی یا کم آمیزی کا مرتکب نہیں ہوا اس اعتبار سے وہ برِصغیر پاک وہند کے باسیوں سے گہری مماثلت رکھتا ہے۔ دونوں زمین کی وسعت اور نسلوں کے اختلاط کی پیداوار ہیں اور اسی لئے اپنے اپنے معاشرے ہی سے نہیں سرحد پار کے معاشروں سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔ والٹ وہٹ مین اسی امریکی مزاج کا نمائندہ ہے مگر وہ امریکہ کا کبیر بھی ہے کہ محبت کا قائل، سرزمینِ وطن کا عاشق اور روح کی لطافت کا اعلامیہ ہے۔

اگر نطشے کی کتاب آسمان سے نازل ہوئی ہے تو پھر والٹ وہٹ مین کی کتاب گھاس کی پتیاں LEAVES OF GRASS کے بارے میں وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ زمین سے پھوٹی ہے۔ جب ۱۸۵۵ء میں یہ پہلی بار شائع ہوئی تو اس کی ضخامت پچانوے صفحات سے زیادہ نہیں تھی لیکن جب یہ متعدد ایڈیشنوں کے بعد ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی تو اس کی ضخامت خاصی ہو گئی تھی۔ یہ کتاب برگد کے درخت کی طرح تھی جس کی جڑیں شاخوں سے اُتر کر زمین میں دھنستی رہتی ہیں اور درخت کے چھتنار میں مسلسل اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ یہ مجموعہ چھوٹی بڑی لاتعداد نظموں کی آمیزش سے ایک ہی بڑی نظم بن کر نمودار ہوا ہے بعینہٖ جیسے لاتعداد افراد کے ملنے سے معاشرہ اور اُن گنت معاشروں کے امتزاج سے نسلِ انسانی کے خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔

جزیرے میں رہتے ہوئے جہاں مجھے نطشے کی ضرورت ہے کہ وہ مجھے غواصی کی ترغیب دے اور بلندی پر سے اشیاء کو دیکھنے پر مائل کرے وہاں مجھے وہٹ مین کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ مجھے اپنی ہی ذات کی چکا چوند سے باہر لاکر اور زمین کی مسند پر اتار کر، انسانوں کے جمِ غفیر کے احساسات سے روشناس کرائے۔ جب تک بدھ برگد کے چھتنار تلے اپنی ہی ذات کی تجلی میں گرفتار رہا اس کی حیثیت ایلپس کی بلندی پر براجمان فریڈرک نطشے سے مختلف نہیں تھی لیکن جب وہ وہاں سے اٹھ کر انسانوں کے درمیان آگیا اور اس نے محبت، مفاہمت، یکتائی اور ہم آہنگی کا درس دیا تو وہ گویا کبیر یا وہٹ مین کے روپ میں نمودار ہوا۔ سوچتا ہوں کہ نطشے اور وہٹ مین شگفتنِ ذات ہی کے دو مرحلے ہیں۔ ایک لمحے کی تابندگی سے اکتسابِ نور کرتا ہے۔ دوسرا اس روشنی کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ ایک اظہار ہے دوسرا ترسیل! جزیرے میں رہتے ہوئے محض اظہار کی سطح

پر زندہ رہنا ممکن نہیں اس لئے مجھے ترسیل کی سطح پر بھی اترنا چاہیئے تاکہ میں اپنی مسرت اور دُکھ میں دوسروں کو بھی شریک کر سکوں یا دوسروں کی مسرت اور دُکھ میں خود بھی شریک ہو سکوں مگر والٹ وہٹ مین محض امریکی برانڈ کی مسرت یا دُکھ تک خود کو محدود نہیں رکھتا۔ بسا اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نسل، رنگ اور قوم کی حدود کو پار کر کے ساری نسلِ انسانی کے دُکھوں اور خوشیوں میں شریک ہے بلکہ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے وہ ساری کائنات میں پھیل گیا ہے۔ "گھاس کی پتیاں" میں محبت بیک وقت قانونِ فطرت بھی ہے اور قانونِ خداوندی بھی اور اس لئے یہ کرۂ ارض ہی پر نہیں ستاروں سے آگے کے جہانوں پر بھی کمند پھینکنے کی خود میں سکت اور ہمت رکھتی ہے:

اے روح

یہ وہ ساعتِ نایاب ہے جب تُو

کتاب، آرٹ، دن اور اس کے اسباق سے اوپر اُٹھ کر

ایک بے تعلق کائنات میں پرواز کر سکتی ہے

اور (اس پرواز کے دوران تُو

ایک خاموش نو وارد تماشائی کی طرح

اُن تمام باتوں پر غور کر سکتی ہے جو تجھے عزیز ہیں۔

یعنی رات، نیند، موت اور ستاروں) کی آبجُو،

اے جوانی

بڑی ہی مہربان، تمکنت توانائی اور کشش سے لبریز جوانی!

کیا تُو جانتی ہے؟

کہ تیرے بعد بڑھاپا بھی اسی کرّ و فر، توانائی اور کشش کے ساتھ نمودار ہوگا

(جیسے)

دن، بھرپور، شاندار۔ آفتاب، حرکت آرزو اور قہقہے سے مزیّن دن

(اور اس کے بعد)

رات، لاکھوں ستاروں کی معیت میں
نیند اور تھکاوٹ کو دور کرنے والی تاریکی کو اپنے (سینے کے) ساتھ لگائے ہوئے!

سفر۔ فوری سفر!
لہو میری شریانوں میں کھولنے لگا ہے
اے روح! لنگر کھول دے
رسیوں کو توڑ
بادبانوں کو کھول
کیا ہم یہاں درختوں کی طرح زمین میں گڑے ہوئے نہیں ہیں؟
کیا ہم یہاں حیوانوں کی طرح محض کھاتے اور اونگھتے نہیں رہے ہیں؟
کیا ہم نے یہاں کتابوں سے خود کو تاریک اور بے حس نہیں کر دیا؟

چنانچہ والٹ وہٹ مین کی کتاب مجھے اس لئے بھی پسند ہے کہ یہ مجھے جزیرے سے باہر نکلنے کی ترغیب دیتی ہے۔ ٹینی سن کے لوٹس ایٹرز نے اپنی تقدیر سے سمجھوتہ کر لیا تھا اور جزیرے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اُونگھنے لگے تھے مگر وہٹ مین کے اندر جذبۂ سیاحت بیدار رہتا ہے۔ ہر امریکی کی طرح اس کے پردے میں بھی کولمبس چھپا ہوا ہے جو اُسے نئی سرزمینوں کی تلاش پر اُکساتا ہے میرے لئے جزیرے کے قیام کے دوران وہٹ مین کی معیت میں نئی نئی سرزمینوں کو دریافت کرنے کی مہم ایک ایسا خوشگوار تجربہ ہے جس سے میں کبھی اُکتا نہیں سکتا۔ اس کی ہمراہی مجھے اس لئے بھی عزیز ہے کہ وہ زندگی کی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے گھاس کی ہر پتی، درخت کی ہر شاخ، پہاڑ کے ہر خم اور سمندر کی ہر موج میں دلچسپی لے سکتا ہے اور پھر مجھے زمین سے اوپر اٹھا کر ایک ایسا منظر بھی دکھا سکتا ہے جس میں شاخیں، پتیاں، موجیں اور خم، زندگی کے ایک ہی وسیع و بے کنار جزر و مد میں پوری طرح ضم ہو چکے ہیں۔ آگے بڑھ کر جزو کو مرکزِ نگاہ بنانا اور پھر پیچھے ہٹ کر اس سارے پس منظر کو دائرۂ نگاہ میں سمیٹ لینا جس میں جزو محض ایک موہوم سا نقطہ ہے بس یہی والٹ وہٹ مین کے مووی کیمرے کا کمال ہے اور یہی اس کا کمالِ فن بھی ہے۔

اور اب کہ جزیرے میں رہتے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہوگیا ہے، میں محسوس کرنے لگا ہوں کہ جزیرے کا یہ باغِ بہشت ایک زندان سے مختلف نہیں۔ زندان کیونکہ انسان دکھ کی قید ہی سے نہیں مسرت کی قید سے بھی اُکتا سکتا ہے (انسان کے جدِ امجد کا باغِ بہشت سے باہر آنا اب سمجھ میں آیا ہے)، میں بھی اس جزیرے (ذات کے اس بندی خانے) سے باہر نکلنے کا آرزومند ہوں۔ اس کے لئے میں تمام عرصہ چپکے چپکے ایک کشتی تیار کرتا رہا ہوں جسے چلانے کے لئے میں نے تین ملاحوں کی خدمات بھی حاصل کرلی ہیں۔ اگر یہ ملاح آپس میں دست وگریبان نہ ہوگئے یا میں اُن سے لڑ نہ پڑا تو آپ دیکھیں گے کہ میں آئندہ برس تک اُس سرزمین کو ضرور تلاش کرلوں گا جہاں سے میں نے اپنے سمندری سفر کا آغاز کیا تھا اور جہاں میرے عزیز واقارب اور دوست احباب ایک زمانے سے میری واپسی کے منتظر ہیں۔

ایک طویل مُلاقات

دسمبر کے آخری ایام میں جب سنہری دھوپ بیتاب سی ہو کر لاہور کے گلے میں اپنی باہیں ڈال دیتی ہے اور لاہور والے اس کے بازوؤں کے لمس پر اپنی ہر شے قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتے اور شہر کی کشادہ اور منور سڑکوں کو چھوڑ کر کسی دُور دیس کو جانا آدابِ نیاز مندی کے منافی قرار دیتے ہیں، میں نے جراُتِ رندانہ کا ثبوت دیا اور ایک چمکتی ہوئی دوپہر میں، بیوی بچوں کو ساتھ لئے چپکے سے اس ریل گاڑی میں جا بیٹھا جو کسی بدروح کی طرح بال کھولے، سیٹیاں بجاتی، لاہور اور امرتسر کے درمیان بوکھلائی ہوئی دوڑتی رہتی ہے۔ گاڑی میں سوار ہوتے ہی مجھے یوں لگا جیسے وقت نے ایک اُلٹی زقند بھری ہے اور میں تقسیم سے پہلے کی فضا میں واپس آ گیا ہوں۔ گویا یہ گاڑی، گاڑی نہیں ایک منجمد لمحہ ہے جس نے وقت کے سیلِ رواں کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا ہے — وہی فرسودہ سیٹیں، کھڑکیوں کے شیشے شکستہ فرش پر غلاظت، غسلخانے میں کیچڑ، دیواروں پر "جو شخص بغیر رضامندی اپنے ہمراہیوں کے" وغیرہ — اور اب یہ بدہیئت روح اپنی ہی ذات کے NO MAN'S LAND میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قید ہے — قید کیونکہ اس کو شاید علم ہی نہیں کہ آزادی کیا شے ہے اور اپنے وطن کی دھرتی کے لمس میں کتنی گرمی اور کیسی راحت ہوتی ہے۔ میرے لئے اس گاڑی کا سفر سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔ وجہ یہ کہ اس گاڑی نے ایسے ایام کی یاد تازہ کر دی جب انگریز نے برِّصغیر کو اپنے پنجوں میں دبوچ رکھا تھا اور یہاں کے باشندے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے مگر خوش قسمتی سے یہ سفر کچھ ایسا طویل نہ تھا اور جب یہ اختتام کو پہنچا تو مجھے محسوس ہوا جیسے وقت نے ایک بار پھر اپنا کرتب دکھایا ہے اور زقند سی لگا کر دوبارہ زمانۂ حال کے پلیٹ فارم

---

۵ دسمبر ۱۹۶۳ء

پر آ گرا ہے۔

مگر اب یہ لاہور کا نہیں امرتسر کا ریلوے پلیٹ فارم تھا جہاں پہنچتے ہی ساری گاڑی آناً فاناً خالی ہو گئی پلیٹ فارم پر ایک عجیب سا ہنگامۂ محشر برپا تھا۔ پولیس کے سپاہی، ریلوے کے ملازمین، کسٹم والوں کی فوج اور بوکھلائے ہوئے مسافر! لیکن جلد ہی اس افراتفری اور انتشار کے پس پشت ایک مخفی سے ضبط و آہنگ کا احساس ہوا اور میں ایک جہاندیدہ سپاہی کی طرح قانون اور ضابطے کے جملہ مراحل سے گزرتا چلا گیا۔ ہندوستان کے لئے روانہ ہونے سے قبل یار لوگوں نے مجھے امرتسر اسٹیشن پر کسٹم والوں کی بدسلوکی کے لرزہ خیز واقعات سنائے تھے۔ پھر روانگی سے صرف ایک روز قبل برادرم قیوم نظر صاحب نے بڑے ڈرامائی انداز میں مجھے ایسے تقدیر کے ماروں کا حال بھی سنایا جو امرتسر اسٹیشن پر قدم رنجہ فرماتے ہی گرفتار ہو گئے تھے اور یہ مشورہ دیا کہ میں ہندوستان کے سفر کا ارادہ ترک کر کے ان کے ساتھ کافرستان کی سیر کو چلوں۔ چونکہ میں خود کافرستان کے سلسلے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا اس لئے میں نے قیوم نظر صاحب کے اس قیمتی مشورے سے استفادہ نہ کیا اور بمبئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ لیکن اب جو امرتسر اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد میں ایک سہمے ہوئے دل کے ساتھ مختلف میزوں پر سے ہوتا ہوا کسٹم والوں کے پاس پہنچا اور انہیں اپنا سامان دکھانے لگا تو یکایک میرا سارا اعصابی تناؤ از خود ختم ہو گیا۔ کسٹم آفیسر صاحب ایک سکھ بزرگ تھے جنہوں نے بڑے ہی حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے خوش آمدید کہا۔ محض ایک آدھ بیگ کھلوا کر اوپر سے کپڑوں کو چھوا اور چاک سے سارے سامان پر کچھ تجریدی سے نشانات لگا کر چھٹی دے دی۔ یکایک ہمارے چہرے کھِل اُٹھے۔ سلیم نے قریب سے گزرتی ہوئی کیلے والے کی ریہڑی پر حملہ کیا اور ایک سچے پاکستانی سیاح کی طرح کسٹم والوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کیلے چبانے لگا۔ مینا نے کیلوں کا مطالبہ تو نہ کیا البتہ چاروں طرف نظریں دوڑانے کے بعد مجھ سے پوچھنے لگی ــ "آغا یہ کیسا ملک ہے جہاں ہر کسی نے داڑھی لگا رکھی ہے؟"

رات آٹھ بجے کے قریب ہم فرنٹیئر میل میں سوار ہوئے اور اگلی صبح دہلی پہنچ گئے۔ ہندوستان کے طویل و عریض میدانوں کو دیکھنے کا شوق اس قدر قوی تھا کہ میں اور مینا پَو پھٹنے سے پہلے ہی بیدار ہو گئے اور کھڑکی سے لگ کر شگفتنِ صبح کے سارے مراحل کو دیکھتے چلے گئے۔ یہ ایک کپکپاتی، ٹھٹھرتی ہوئی صبح تھی۔ دُھند اور روشنی کی آویزش نے فضا کو سحر انگیز بنا دیا تھا۔ پھر شمال مشرق کی طرف جہاں ہمالہ ایک

سنتری کی طرح کھڑا ہے، بادلوں کے کنارے واضح ہونے شروع ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سارے بادل گلابی اور قرمزی رنگوں میں تحلیل ہو گئے اور سارا منظر ایک نگینے کی طرح دمکنے لگا۔ یکایک میرے ذہن میں دو باتیں بالکل واضح ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ شاید صبح کی اس دمک ہی نے اہلِ ہند کے دلوں میں اس حقیر دھات کے لئے ایک مجنونانہ لگاؤ پیدا کیا ہے جسے "سونا" کہتے ہیں اور دوسری یہ کہ شاید صبح کا یہی جادو تھا جس نے سب سے پہلے آریاؤں کے قافلوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ اس سہانی صبح کی ڈور سے بندھے ہوئے پچھم سے پورب کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ رگ وید میں صبح کے درخشاں مناظر کو جس خوبصورتی سے محفوظ کیا گیا ہے، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ پنجاب میں آنے کے بعد یہاں کی دمکتی ہوئی صبحوں نے آریاؤں کو بطورِ خاص متاثر کیا تھا۔ ہزاروں برس بعد جب بیسویں صدی میں اردو کے عظیم شاعر اقبال نے فکرِ سخن کا آغاز کیا تو سب سے پہلے اس سہانی صبح ہی کے گن گائے۔ شاید پنجاب میں صبح کے اس جادو کی کیفیت ازلی و ابدی ہے اور حساس دل ہمیشہ اس کے سنہری زنار سے بندھے اور اشلوک گاتے گزرتے چلے جائیں گے۔

لاہور سے روانہ ہونے سے قبل میں نے دہلی میں بلراج کومل کو اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا۔ بلراج کومل سے میری ملاقات اس سے پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ لیکن خطوں میں ہم ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ آج سے چند برس قبل جب ادبی دنیا کے حصۂ نظم کی ادارت مجھے سپرد ہوئی تو قدرتی طور پر مجھے اُن جدید اُردو شعرا سے مراسم قائم کرنے کی ضرورت پڑی جو اس میدان میں بڑی توانائی کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ چنانچہ کومل سے بھی خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ بعد ازاں ادارہ ادبی دنیا نے ان کی نظموں کا مجموعہ "رشتۂ دل" کے نام سے شائع کیا جو ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ لیکن بلراج کومل سے میرے مراسم محض "مدیرانہ" نہ تھے۔ ایک طویل عرصے کی خط و کتابت نے ہمیں احساسی سطح پر بھی ایک دوسرے سے خاصا متعارف کر دیا تھا اور اب ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ دہلی اسٹیشن میں گاڑی داخل ہوئی تو میں نے پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے ہجوم میں کومل کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن تصویر کے نقوش میرے لئے کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہ ہوئے۔ البتہ بھیڑ میں سے ایک اجنبی سا چہرہ مجھے دیکھ کر یکایک مسکرایا اور اُس نے اپنے ساتھی کو کہنی مار کر میری طرف متوجہ کیا اور پھر یہ دونوں دوڑتے ہوئے آئے اور مجھ سے بغلگیر ہو گئے۔ میری نشان دہی کرنے والے کمار پاشی تھے جنہیں میں نے اس سے قبل کبھی نہ دیکھا تھا لیکن انہوں نے کسی

فرسودہ سنے رسالے میں میری کوئی فرسودہ سی تصویر دیکھ رکھی تھی اور اب یہ تصویر میرے چہرے کی فرسودگی کے عین مطابق ثابت ہوئی تھی۔ بہر حال ان کے بے پناہ حافظے کی داد نہ دینا بڑا ظلم ہوگا۔ دوسرے صاحب بلراج کومل تھے بلراج کومل کی نظموں اور خطوں کو پڑھ کر میرے ذہن نے ان کا جو چہرہ تشکیل دیا تھا اس پر زمانے نے اپنی گہری لکیریں ثبت کر رکھی تھیں لیکن گوشت پوست کی زندگی میں وہ ایک ہنس مکھ انسان کے روپ میں ابھرا اور سچی بات تو یہ ہے کہ کومل کے اس روپ کو دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ہم پلیٹ فارم پر کھڑے جلدی جلدی ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے بلکہ پہلی ملاقات کی گھبراہٹ میں باتوں کے لئے موضوعات تلاش کر رہے تھے کہ دفعتاً ایک بزرگ ہولے ہولے چلتے میرے پاس آ کھڑے ہوئے۔ بڑی انکساری اور محبت سے انہوں نے میرا نام پوچھا اور بڑے تپاک سے مصافحہ کیا۔ آپ حافظ محمد عثمان تھے اور پیری اور علالت کے باوجود مجھے ملنے چلے آئے تھے۔ وہ صرف چند لمحے ہی ٹھہرے لیکن اس مختصر سے عرصہ میں میرے دل پر اپنی بزرگی، خلوص اور مروت کا ایک گہرا نقش چھوڑ گئے ع

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

باتیں کرنے کے لئے پلیٹ فارم کچھ زیادہ موزوں جگہ نہیں۔ چنانچہ ہم لوگ ریل کے ڈبے میں جاکر بیٹھ گئے۔ یہاں ہمارے ہاتھوں میں چائے کی ایک ایک پیالی تھما دی گئی اور شاید کھانے کے لئے بھی کچھ ملا لیکن اس وقت ان باتوں کا کسے ہوش تھا۔ ہمارے ہاتھ میکانکی انداز میں حرکت کرتے رہے اور زبانیں باتیں اگلتی رہیں۔ درمیان میں جب کوئی زبان چائے کی چسکی کے لئے رکتی تھی تو دوسری بات کے دھاگے کو تھام لیتی تھی۔ زمانے بھر کی باتیں ہو گئیں۔ کومل کے مجموعے "رشتۂ دل" پر بعض تعصب آمیز تبصروں کا ذکر آیا، نظم میں علامتوں کے استعمال پر خیالات کا اظہار ہوا، لاہور کے بعض نو آموز شعرا کی منطقی ربط سے ناآشنا نظموں کا ذکر چھڑا اور پھر ان انگریزی کتب کی باتیں ہوتی رہیں جو ہم تینوں نے پچھلے چند ماہ میں پڑھی تھیں۔ دراصل اس ملاقات کے فوراً بعد ہی وقت سے ایک جنگ سی چھڑ گئی تھی اور ہم پون گھنٹے کے اس وقفے میں زیادہ سے زیادہ لاوا اگل دینا چاہتے تھے۔ لیکن ایسے موقعوں پر جیت ہمیشہ وقت کی ہوتی ہے اس بار وقت نے اپنی فتح کا اعلان ریل کی سیٹی سے کیا۔ ہم پھر بھی ڈٹے رہے لیکن ریل حرکت میں آ گئی تو کومل اور کمار کو نیچے اترنا پڑا۔ اس کے بعد الوداعی سلام، ہاتھ کے اشارے، بجھتی ہوئی مسکراہٹیں اور اداسی! ہر مسافر کو ان مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ بعض اس کیفیت کو پسند بھی کرتے ہیں، بعض کو تکلیف

ہوتی ہے۔ میں دروازہ بند کر کے بجھے ہوئے دل کے ساتھ اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ ڈبے میں تکمل خاموشی تھی۔ پھر یکایک میری بیوی نے جو اس ساری گفتگو کے دوران میں بالکل چپ بیٹھی رہی تھی، اپنی زبان کھولی اور ایک گرم ساطنز یہ فقرہ میرے کانوں سے آکر ٹکرا گیا۔ "عورتیں بے چاری تو مفت میں بدنام ہیں، تو یہ ہے!"

فرنٹیر میل جب نئی دہلی کے اسٹیشن سے آگے بڑھی تو دھند بالکل ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ میں سلیم اور مینا ایک کھڑکی میں گٹھڑی سی بن کر بیٹھ گئے اور دلّی کی بکھری ہوئی عمارتوں کو دیکھنے لگے۔ سلیم اور مینا نے ہندوستان کی جو تصویر ذہن میں بنا رکھی تھی اس میں آوارہ پھرتے ہوئے بندروں، موروں، اور سوؤروں کی فراوانی تھی اور اب وہ مجھ سے مطالبہ کر رہے تھے کہ میں فوراً ان کے لئے یہ جانور مہیا کروں۔ ان میں سے بندر اور مور تو وہ لاہور کے چڑیا گھر میں دیکھ بھی چکے تھے لیکن انہیں آزاد حالت میں دیکھنے کی تمنا ان کے دلوں میں شاید بہت قوی تھی۔ سوؤروں کی تو اب پاکستان میں بھی کمی نہیں لیکن یہ سب جنگلی سوؤر ہیں۔ جو رات کو شبخون مارتے ہیں اور نازک فصلوں کو تباہ و برباد کر کے دن کو کمیں گاہوں میں چھپ جاتے ہیں چنانچہ ان کے "مداح" ان کی "موہنی" صورتوں کو ایک نظر دیکھنے کے لئے ترس گئے تھے۔ اب مطالبہ یہ تھا کہ میں کسی جادو کی چھڑی سے یہ تینوں چیزیں فوراً پیدا کر دوں۔ اتفاق دیکھئے کہ آدھ ہی گھنٹے کے اندر اندر میرا وہ وعدہ جو میں نے بچوں سے کر رکھا تھا۔ بڑے معجزانہ طریق سے پورا ہو گیا۔ پہلے تو ہمیں دہلی کے ایک مندر کے کلس پر سے ہنومان جی نے درشن دیا۔ یہ شاید اس کارواں کا آخری مسافر تھا جس نے پچھلے دنوں دہلی پر انسان کے غاصبانہ قبضے کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنا "جلوس" نکالا تھا اور حکومتِ ہند نے بغیر سوچے سمجھے اس پر "لاٹھی چارج" کا حکم دے دیا تھا۔ بہر حال اسے دیکھ کر سلیم اور مینا بہت خوش ہوئے۔ پھر دہلی کے مضافات ہی میں پالتو سوؤروں کے گلے چرتے ہوئے نظر آئے اور بچوں نے نعروں اور تالیوں سے ان کا "سواگت" کیا۔ اور جب دہلی کا آباد علاقہ ختم ہوا اور کھیتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تو جگہ جگہ موروں کے جوڑے بھی نظر آنے لگے اور بچوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ تہذیب اور عمر کے موٹے موٹے لبادوں کے باوصف میں خود دل ہی دل میں ان چیزوں کو آزاد فضا میں دیکھنے کا متمنی تھا۔ اب جو یہ تمنا پوری ہوئی تو دل کو ایک میٹھی سی راحت کا احساس ہوا۔

اس روز شام تک فرنٹیئر میل نے تقریباً تین سو میل کا فاصلہ طے کیا اور ہم سب ریل کی کھڑکیوں سے چمٹے ہندوستان کے فراخ میدانوں اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا نظارہ کرتے چلے گئے۔ اس سے قبل میں صرف ایک بار بمبئی گیا تھا لیکن یہ کوئی بیس برس پہلے کی بات ہے۔ شاید وہ نوجوانی کی نظر تھی یا ویسے ہی گرمیوں کا موسم تھا کہ مجھے دہلی سے روانہ ہو کر راست پڑنے تک کا یہ سارا سفر ایک لق و دق صحرا کا سفر معلوم ہوا تھا۔ ہر طرف جلی جھلسی ہوئی کائنات تھی جس میں جلی جھلسی ہوئی پہاڑیاں نصب کر دی گئی تھیں لیکن اب یہ بات کہاں تھی! پہلے تو ہمیں میلوں تک کارخانے کا ایک کارواں نظر آیا۔ پھر جب یہ کارواں، تھک ہار کر رک گیا تو قدرت کے کارخانے کا آغاز ہوا۔ ہر طرف سرسبز و شاداب کھیت تھے۔ جگہ جگہ پانی کے قطعے آجاتے تھے جن میں ہزاروں کی تعداد میں آبی پرندے، ہنستے کھیلتے یا خوراک تلاش کرتے دکھائی دیتے تھے۔ بچوں کے لئے اس سے زیادہ جاذبِ نظر اور کون سا منظر ہو سکتا تھا چنانچہ جب وہ پرندوں کی اس دنیا میں کھو گئے تو میں انسانوں اور پتھروں کی دنیا میں لوٹ آیا۔ میرے لئے سب سے دلچسپ علاقہ متھرا کا تھا۔ متھرا اسٹیشن پر گاڑی رکی تو میں متھرا کے پیڑوں کی تلاش میں پلیٹ فارم پر اتر آیا۔ عصمت صاحب نے سلیم کو نصیحت کر رکھی تھی کہ متھرا پہنچ کر متھرا کے پیڑے ضرور کھائے اور اگر ممکن ہو تو کسٹم والوں کی آنکھوں میں راکھ جھونک کر کچھ ان کے لئے بھی لے آئے۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ پیڑوں کو خطرہ کسٹم والوں سے اس قدر نہیں تھا جتنا پیڑوں کے نگہبان سے! بہر حال میں پیڑوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا لیکن جب مجھے یہ پیڑے دکھائی دیئے تو میں واقعتاً وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ کوئی مٹھائی اس قدر غلیظ اور بدوضع بھی ہو سکتی ہے، اس بات کا مجھے علم نہیں تھا۔ لیکن متھرا سے میری دلچسپی پیڑوں کے باعث نہیں تھی بلکہ سنگتراشی کے اُس آرٹ کے باعث تھی جو حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے لگ بھگ اس علاقے میں اپنے عروج پر پہنچا تھا۔ سنگتراشی کے اس سکول کے پروان چڑھنے کی غالباً دو وجہیں تھیں پہلی تو یہ کہ اس علاقے میں ایسا پتھر دستیاب تھا جو مجسمہ بنانے کے لئے بڑا کارآمد تھا۔ اب بھی اس پتھر کی بڑی بڑی سلیں جگہ جگہ نظر آتی ہیں اور اہلِ ہند اب تک ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ لیکن انسان نے آرٹ کی دنیا سے کاروباری دنیا کی طرف جو پیش قدمی کی ہے اس کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ پہلے اس پتھر سے آرٹ کے مجسمے بنائے جاتے تھے۔ اب اس سے ریل کی پٹڑیوں پر بچھانے کے لئے بجری تیار ہوتی ہے۔ دوسری

وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے میں پنجاب اور فرنٹیئر کے علاقے میں گندھارا آرٹ نے فروغ حاصل کیا تھا جس سے متھرا آرٹ نے واضح اثرات قبول کئے۔ گندھارا آرٹ یونانیوں کی مجسمہ سازی کا آرٹ تھا اور اگرچہ اس آرٹ کے موضوعات ہندوستانی تھے۔ تاہم ملبوسات کی فراوانی، مرد کے جسم کو پیش کرنے کا رجحان اور آقلیدسی انداز کا رواج۔ یہ سب باتیں خالص یونانی تھیں لیکن اسی زمانے میں متھرا آرٹ نے گندھارا آرٹ کے ہندوستانی روپ کو پیش کیا۔ لباس کو جسم سے اس طور چپکا دیا گیا جیسے کوئی گیلا کپڑا ہو۔ اس سے جسم کے خطوط واضح ہو کر سامنے آ گئے۔ پھر اس میں مرد کے جسم کی بجائے عورت کے جسم کو پیش کرنے کا رجحان بھی ابھرا اور ہندوستانی عورت کا وہ پیکر واضح ہو گیا جو ہندو آرٹ میں ہمیشہ سے بہت مقبول رہا ہے۔ یعنی بھرے بھرے کولہے، بھرپور چھاتیاں، تپلی کمر اور کولہے کا ایک طرف کو واضح جھکاؤ!

لیکن فرنٹیئر میل میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں سفر کرتے ہوئے آرٹ کا کچا مواد تو نظر آجاتا ہے لیکن آرٹ کے نمونوں تک پہنچنا ذرا مشکل ہے۔ حکومتِ ہند کو چاہیئے کہ اگر وہ ایذا رسانی کے جذبے کے تحت ویزا کی مشکلات کو قائم ہی رکھنا چاہتی ہے تو کم از کم مجھ ایسے بدنصیب سیاحوں کے لئے ریلوے پلیٹ فارم پر ہی آرٹ کے چند ایک مجسمے پہنچا دے۔ بہر حال اب کے میں آرٹ کے ان نمونوں سے دُور تھا تو میں نے حسرت بھری نظریں ان پہاڑوں پر ڈالیں جن پر چاروں طرف کالے پتھر کی سلیں بکھری پڑی تھیں اور پھر اُن لاتعداد عورتوں کی طرف دیکھا جو چاروں اور کھیتوں میں کام کر رہی تھیں۔ یہی وہ عورتیں تھیں جنہوں نے آج سے دو ہزار برس پہلے متھرا کے فن کاروں کو مجسمہ سازی کی تحریک دی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ انسان فانی ہے اور پتھر باقی رہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انسان بھی پتھر ہے اور پتھر ہی کی طرح زندۂ جاوید! اگر ایسا نہ ہوتا تو آج اس علاقے میں وہ عورتیں کہاں نظر آتیں جن کے نقوش آج سے دو ہزار برس پہلے کے مجسموں میں کمال خوبصورتی سے اُبھر آئے تھے!

اُس روز ہمیں رات کی تاریکیوں کے مسلط ہونے تک یہ عورتیں کھیتوں میں کام کرتی۔ ریوڑوں کو ہانکتی بکریاں ڈھوتی اور کھُلے میدانوں میں کچھ تلاش کرتی ہوئی نظر آتی رہیں۔ ان سب کا لباس ایک سا تھا جس میں نمایاں ترین چیز۔ سُرخ رنگ کا گھگھرا تھا۔ دہلی سے باہر آتے ہی یہ گھگھرا شروع ہوا اور شام ہونے تک دکھائی دیتا رہا پھر مغرب کی طرف شام بجائے خود ایک سُرخ گھگھرا پہنے نمودار ہوئی جسے سیہ گھگھرے والی رات نے آنِ واحد میں دھکیل کر نظروں سے اوجھل کر دیا۔ اگلی صبح جب ہم بیدار ہوئے تو گھگھرا غائب تھا اور اس کی جگہ سفید ساڑھی

نے لے لی تھی۔ میری بیوی سفر کے آغاز ہی سے عورتوں کے لباس میں دلچسپی لے رہی تھی۔ بمبئی پہنچ کر اس نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے جنوب مغربی علاقوں کی تقسیم از سرِ نو زبان کے بجائے لباس کی بنیاد پر ہونی چاہیئے۔ یعنی امرتسر سے دہلی تک شلوار سٹیٹ، دہلی سے رتلام تک گھگرا اسٹیٹ اور رتلام سے بمبئی تک ساڑھی اسٹیٹ! لیکن افسوس کہ ہر عمدہ تجویز کی طرح یہ تجویز بھی محض تفننِ طبع کا موجب قرار پائی اور کسی نے سنجیدگی سے اس کا نوٹس نہیں لیا۔ لیکن ذکر گھگرا اسٹیٹ کا تھا۔ میرے لئے اس سٹیٹ میں سفر کرتے ہوئے دلچسپی کی ایک بات یہ بھی تھی کہ اس کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر کہیں کہیں پرانے قلعے نظر آ جاتے تھے۔ یہ قلعے اس رومانی دور کی یادگار تھے جس میں حسن، شجاعت اور عشق کی تثلیث وجود میں آئی تھی۔ میری چشمِ تصور کے سامنے وہ راجپوت شہزادے اُبھر آئے جو اپنی محبوباؤں کو اپنے ساتھ گھوڑوں پر بٹھائے آندھی کی سی رفتار کے ساتھ آتے اور ان پتھر کے شہروں میں قلعہ بند ہو جاتے تھے۔ پھر جب دشمن ان قلعوں کا محاصرہ کر لیتا تھا اور بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی تھی تو یہی شہزادے قلعوں سے نکل کر دشمن سے لڑتے لڑتے ہلاک ہو جاتے تھے اور ان کی محبوبائیں لکڑیوں کی چتا بنا کر اس میں بھسم ہو جاتی تھیں ــ عجیب دور تھا! ــ لیکن اب یہ قلعے بالکل ویران ہیں۔ پہاڑیوں پر چاروں طرف چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں کے جنگل اُگ آئے ہیں اور قلعوں کو جانے والے راستے ناپید ہو گئے ہیں۔

امرتسر سے دہلی تک کا سفر رات کی تاریکیوں میں طے ہوا تھا۔ اس لئے ہم کسی شے پر بھی تنقیدی نظر نہ ڈال سکے تھے لیکن دہلی سے رتلام تک کا سفر دن کی روشنی میں ہوا اور ہمیں چاروں طرف دیکھنے کی پوری فرصت مل سکی۔ اس سفر کے دوران میں ایک یہ احساس بہت قوی تھا کہ ہندوستان کے اسٹیشن بہت غلیظ ہیں۔ ریلوے میں کام کرنے والے ملازمین کا لباس عام طور سے گندا اور سیاہی مائل ہے اور فرنٹیئر میل ایسی گاڑی بھی بدرنگ سی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تقسیم کے بعد ہندوستانی ریلوے نے بہت ترقی کی ہے اور تقریباً تمام گاڑیاں اور انجن ہندوستان کے اپنے کارخانوں میں تیار ہونے لگے ہیں لیکن نجانے کیا وجہ تھی کہ ہمیں اس سفر میں ویسی راحت اور صفائی نصیب نہ ہو سکی جیسی پاکستانی ریلوں میں سفر کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور پھر یکایک بات آئینہ ہو گئی۔ ہندوستان میں کوئلے کی فراوانی ہے اور اس لئے اس کی ریلیں ابھی COAL AGE سے گزر رہی ہیں لیکن پاکستان نے کوئلہ نہ ملنے کے باعث اپنا ایک قدم DIESAL AGE میں بھی رکھ لیا ہے۔ اسی لئے

پاکستان کے اسٹیشن اب صاف ستھرے سے ہیں، ریل کے بعض ڈبے تو ڈرائنگ روم بن گئے ہیں اور جب مسافر ملتان سے لاہور تک کا سفر کرتا ہے تو لاہور اسٹیشن پر آئے ہوئے احباب اُسے فوراً پہچان لیتے ہیں لیکن ہندوستان میں ابھی یہ بات نہیں! وہاں تو کوئلے سے چلنے والی گاڑی میں اگر طویل سفر کرنا پڑے تو منزل پر شناختی کارڈ ہی سے مسافر کی نشان دہی ہو سکتی ہے۔ یہی حال ہمارا تھا۔ چنانچہ شام کے قریب جب ہم نے ایک دوسرے کے چہروں کو ذرا غور سے دیکھا تو کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

رتلام تک پہنچتے پہنچتے موسم خاصا تبدیل ہو چکا تھا۔ بے شک فضا میں ابھی خنکی موجود تھی لیکن وہ کڑاکے کی سردی جس نے لاہور سے دہلی تک کے سارے علاقے کو برف کی ایک قاش میں تبدیل کر رکھا تھا، یہاں موجود نہیں تھی۔ رات ہی رات میں موسم کچھ اور بھی تبدیل ہو گیا۔ اگلی صبح جب ہم بیدار ہوئے تو سویٹروں کو بھی الوداع کہنا پڑا اور رضائیاں بھی لپیٹ کر ایک طرف رکھ دینا پڑیں۔ لیکن میں گجرات کاٹھیاواڑ اور بمبئی کے موسم کو گرمی کے موسم کا نام نہیں دوں گا۔ بس ایک میٹھی میٹھی خنک سی کیفیت تھی جس میں نہ گرمی تھی ہم نہ سردی! باہر منظر بھی بالکل تبدیل ہو چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی خوشنما اور سرسبز و شاداب پہاڑیوں، ناریل کے جھنڈوں، کیلے، آم اور چیکو کے باغوں اور ہولے ہولے بہتی ہوئی ندیوں نے ایک نہایت سہانا سماں پیدا کر دیا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہمارے ڈبے کی دونوں کھڑکیاں دو چوکھٹے ہیں جن میں بحرالکاہل کے جزیروں کی حسین تصاویر آویزاں کر دی گئی ہیں فضا میں ایک عجیب سی غنودگی اور تھکی تھکی سی کیفیت تھی۔ یہی جی چاہتا تھا کہ زنجیر کھینچ کر گاڑی ٹھہرا لیں اور اڑھائی سو روپیہ جرمانہ کی رقم چپکے سے ادا کر کے ناریل کے کسی جھنڈ کے نیچے سمادھی لگا کر بیٹھ جائیں۔ موسم اور فضا کا اثر انسانی طبائع پر کس قدر قوی ہے۔ اس کا احساس مجھے اس سہانی صبح کو ہوا۔ شمالی علاقوں میں حسیات کو برانگیختہ کر دینے کی خاصیت ہے۔ اسی لئے وہاں کے ادب میں جذبے کا والہانہ پن اور توانائی، لہجے میں تشدید اور رقص (بھنگڑا) میں دھما چوکڑی کی سی کیفیت ہے جب کہ جنوبی ہندوستان میں جذبے کی تہذیب کے شواہد عام ہیں، لہجے میں لوچ اور روانی ہے اور رقص (بالخصوص بھارت نیتم) میں صاف شفاف ندی کا سا بہاؤ اور دبے پاؤں چلتے ہوئے جھونکے کی سی سرسراہٹ ہے۔

جنوبی ہندوستان کی غنودگی اور بے حسی میں لپٹی ہوئی سرزمین کے لئے بمبئی کا شہر ایک اجنبی

کی طرح ہے۔ بس یہی محسوس ہوتا ہے جیسے الہ دین کے چراغ کی مدد سے رات ہی رات میں یہ شہر کسی مغربی ملک سے لا کر یہاں نصب کر دیا گیا ہے۔ اسے آپ شہد کے چھتے سے بھی تشبیہ دے سکتے ہیں۔ ہمیں بمبئی میں داخل ہونے کی اطلاع ان اڑتی ہوئی شہد کی مکھیوں نے دی جو الیکٹرک ٹرینیں کہلاتی ہیں اور جو اب بھنبھناتی ہوئی ہماری گاڑی کے دائیں بائیں سے گزر رہی تھیں۔ تقریباً ایک گھنٹہ تک ہماری گاڑی بمبئی کے مختلف سٹیشنوں سے گزرتی رہی اور بالآخر اپنی منزل یعنی بمبئی سنٹرل میں جا داخل ہوئی۔ بمبئی سنٹرل کے سٹیشن پر ہم سب کی نظریں راجہ مہدی علی خان کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ نہ اس سے پہلے راجہ صاحب نے ہمیں دیکھا تھا اور نہ ہم نے راجہ جی کو! لیکن ان کی تصاویر نے ہمیں ان سے کافی متعارف کرا دیا تھا۔ مینا اور سلیم نے استفسار کیا کہ ہم راجہ جی کو کیسے پہچانیں گے۔ میں نے جواباً کہا کہ پلیٹ فارم پر تمہیں جو سب سے موٹا شخص بے اختیار ہنستا ہوا نظر آئے وہی راجہ مہدی علی خان ہوگا۔ اتفاق دیکھئے کہ پلیٹ فارم پر بکھرے ہوئے دق زدہ چہروں اور کالے کلوٹے پنجر نما انسانوں میں ہمیں ایک ہنستا ہوا "ابوالہول" بالکل الگ تھلگ کھڑا ہوا نظر آیا اور قطعاً غیر شعوری طور پر ہم سب کی انگلیاں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ راجہ صاحب نے بھی ہمیں پہچان لیا لیکن انہوں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ اپنے ساتھ دوستوں کی ایک پوری فوج لائے تھے۔ پھر قلیوں سے لے کر ٹکسی ڈرائیوروں تک کو انہوں نے پہلے سے اپنے قبضے میں کر رکھا تھا۔ وہ روایتی گل محمد کی طرح اپنی جگہ پر کھڑے پان چباتے اور ہنستے رہے۔ وہیں سے ہاتھ ہلا ہلا کر قلیوں کو ہدایات براڈ کاسٹ کرتے اور انڈین ریلوے پر سنسکرت آمیز ریڈیائی زبان میں لعنتیں بھیجتے رہے۔ کھڑے ہی کھڑے انہوں نے مجھے کھینچ کر خود سے لپٹا لیا، کھڑے ہی کھڑے مینا اور سلیم کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور کہرام برپا کرنے میں مصروف ہو گئے۔ پندرہ منٹ کے اندر اندر ہمارا سامان ریڑھیوں پہ لاد دیا گیا تھا اور قافلہ باہر کی طرف کوچ کر رہا تھا۔ اب راجہ صاحب نے پہلی بار خود کو جنبش دی اور گیٹ کی طرف قدم بڑھائے۔ میں نے پلیٹ کراس "مقدس" مقام کا جائزہ لیا جہاں راجہ صاحب پچھلے ایک گھنٹے سے کھڑے رہے تھے۔ وہاں اب پان کی پیکوں سے ایک اچھا خاصا جوہڑ وجود میں آ گیا تھا اور چند سہمے ہوئے مسافر اسے غور غور سے تک رہے تھے۔

(۲)

راجہ صاحب کا مکان باندرہ کے علاقے میں پالی روڈ کے ایک کونے میں گم صم سا کھڑا ہے ہم اس میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے طاہرہ بہن نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ادب کے میدان میں وہ طاہرہ سلطانہ مخفی کے نام سے مشہور ہیں اور شاید ہندوستان اور پاکستان میں وہ واحد ہستی ہیں جو راجہ مہدی علی خان کی طنز یہ یلغار کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ طاہرہ بہن کا مکان مختصر لیکن صاف ستھرا ہے اور بڑے سلیقے سے آراستہ کیا گیا ہے۔ ہم اندر جا کر بیٹھ گئے اور پھر یکایک کرسیوں، میزوں، بستروں، دروازوں اور کھڑکیوں میں سے رنگ رنگ کی بلیاں برآمد ہونے لگیں۔ یہ سب بلیاں راجہ صاحب اور طاہرہ سلطانہ نے پال رکھی ہیں اور ان کے گھر میں بچوں کی کمی کو پورا کرنے کی ایک دلفریب کوشش ہیں۔ لیکن ابھی ہم بمشکل بلیوں کی یلغار سے سنبھلے تھے کہ ایک اور کردار باورچی خانے کے دروازے میں آکھڑا ہوا۔ اس کردار کا نام کالنشی ناتھ ہے اور وہ راجہ صاحب کا باورچی ہے کالنشی ناتھ کا رنگ سیاہ ہے لیکن دانت بہت سفید ہیں۔ وہ جب اندھیرے میں کھڑا ہوتا ہے تو نظر ہی نہیں آتا لیکن جب ہنستا ہے تو تاریکی میں بجلی سی چمک جاتی ہے۔ کئی بار میں نے سوچا کہ اگر کالنشی ناتھ کو چند کینٹوز حفظ کرا دیئے جائیں تو وہ ہندوستان کے مشاعروں میں اچھی خاصی داد وصول کر سکتا ہے آئندہ دس روز تک ہم اس مختصر سے گھر میں راجہ صاحب، کالنشی ناتھ اور ان کی بلیوں کے رحم و کرم پر رہے اور طاہرہ بہن لکیر کو عبور کر کے ہمارے قافلے میں شامل ہو گئیں۔ گویا وہ خود ہی اپنے گھر کے "عظیم" کرداروں سے برسرپیکار ہو گئیں۔

اس روز کھانے کی میز پر راجہ صاحب سے میری دوسری ملاقات ہوئی۔ کھانا بہت لذیذ تھا گاڑی میں ہمیں خاصا بدمزہ کھانا ملا تھا لیکن اب اس کی تلافی ہو گئی۔ ہم نے بھی خوب سیر ہو کر کھایا اور راجہ صاحب ہولے ہولے لقمہ چباتے اور ایک پر لطف مسکراہٹ سے ہماری حرکات کا جائزہ لیتے رہے۔ کھانے کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ یا تو مہمانوں کو کھانا پسند نہیں آیا اور یا وہ مُلک کے اس علاقے سے آئے ہیں جسے "ترنتارن" کہتے ہیں۔ ہم حیران تھے کہ خدایا یہ کیا بات ہے ہم نے تو اپنی سکت سے بڑھ کر کھانا کھایا ہے لیکن راجہ صاحب کو ہم اس میدان میں قطعاً بہتمی نظر آئے ہیں۔ اگلے روز راجہ صاحب نے عملاً ہمیں بتایا کہ سخنور اس طرح سہرا کہتے ہیں۔ اس کے بعد

جب انہوں نے مجھے جوابِ آں غزل کی دعوت دی تو میرا رنگ فق ہو گیا۔

کھانے کے بعد ہم نے پولیس سٹیشن میں اپنی آمد کی اطلاع دی اور فارغ ہو گئے۔ اب بمبئی کا شہر تھا۔ پورے دس سنہری دن تھے اور ہم! لیکن ہمارے لئے اس قیام کا ایک لمحہ ضائع کرنا بھی ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ہم نے ایک ٹیکسی لی اور بمبئی کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا دیا۔ ٹیکسی پالی ناکا سے نکل کر چوپاٹی کی طرف بڑھنے لگی۔ جیسے جیسے ہم آگے کو بڑھے ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور سڑکوں پر موٹروں نے ایک سیلِ رواں کی صورت اختیار کر لی۔ بمبئی میں موٹروں کی تعداد سینکڑوں میں نہیں بلکہ ہزاروں میں ہے اور پھر بھی یہ اس کی آبادی کے لئے ناکافی ہیں۔ بے شک بمبئی کی آبادی پچاس لاکھ سے کسی طور کم نہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ یہ ساری متحرک آبادی ہے۔ پھر خود بمبئی ایک مستطیل کی طرح ہے۔ چوڑائی کم لمبائی زیادہ! چنانچہ فاصلے بھی بہت زیادہ ہیں۔ کئی بار فلم دیکھنے کے لئے ہمیں آنے جانے میں تیس۳۰ پینتیس۳۵ میل کا سفر کرنا پڑتا تھا لیکن یہ سفر تو اہلِ بمبئی کا معمول ہے۔ تانگوں، رکشاؤں، موٹروں، ٹیکسیوں، بسوں، ٹراموں اور برقی ٹرینوں پر خلقِ خدا ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سفر کے چکر میں گرفتار ہے۔ ہر طرف لہریں ہی لہریں ہیں، حرکت ہی حرکت ہے! شاید یہ اس کے چاروں طرف پھیلے ہوئے سمندر کے جزر و مد کا اثر ہے یا جائے کم اور مردماں بسیار اس کا باعث ہے یا شاید یہ ایک داخلی ہیجان کا نتیجہ ہے کہ بمبئی میں رفتار کی فراوانی کا شدید احساس ہوتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے کسی شریر لڑکے نے اپنی چھڑی سے شہد کے چھتے کو چھیڑ دیا ہو اور اب چھتے میں ایک کہرام سا برپا ہو گیا ہو۔ مکھیاں ایک پُر شور بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو کر ہر شے کو کاٹنے پر تُل گئی ہوں۔ اہلِ بمبئی رفتار کی بھنبھناہٹ میں اسیر ہیں۔ وہ چلتے ہیں، دوڑتے ہیں، پھر جیسے اُڑتے لگتے ہیں۔ گھر پہنچنے کے لئے بازار یا دفتر تک جانے کے لئے یا تفریح گاہوں یا سینما ہاؤسوں میں داخل ہونے کے لئے انہیں بڑی عجلت کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔ اس تیز رفتاری نے بمبئی والوں کی زبان اور مزاج میں بھی تیزی اور جھلاہٹ سی سمو دی ہے۔ میں نے بمبئی میں جس کسی سے بات کی اس نے اس تیزی سے مجھے جواب دیا کہ میں لفظوں کا تعاقب کرتے ہوئے ہانپنے لگا۔ یہی حال ان کے مزاج کا ہے۔ ذرا سی بات پر چیں بجبیں ہو کر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کے ہاں ایک عجیب بات یہ دیکھنے میں آئی کہ جہاں وہ

آدمی لڑ رہے ہوں وہاں تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے ہیں لیکن مجال ہے کہ کوئی بیچ بچاؤ کرنے کی کوشش کرے۔ لاہور میں بات اس کے بالکل برعکس ہے۔ یہاں بیچ بچاؤ کا عمل ایک روایت کی حیثیت رکھتا ہے اور جب دو مسلمان بھائی آپس میں لڑنے کی تیاری کرتے ہیں تو بیچ بچاؤ کرنے والوں کا پہلے سے انتظام کر لیتے ہیں۔ ادھر کوئی للکارا کہ مہربان لڑائی فساد سے باز آجاؤ اور اُدھر روایت کے احترام میں ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے اور زبانیں حرکت میں آگئیں۔ دراصل اہلِ لاہور صرف گالیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے جھگڑا کھڑا کرتے ہیں۔ اور گالیوں پر انہیں جو قدرت اور عبور حاصل ہے اور اس میدان میں انہوں نے جو تخلیقی سرگرمیاں دکھائی ہیں، دنیا کے کسی اور خطے میں ممکن نہیں! لیکن بمبئی میں لڑائی کے کردار بیچ بچاؤ کرنے والوں کو من حیث القوم سخت نفرت کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ادھر کوئی بھولا بھالا اجنبی بیچ میں کودا اور اُدھر چاقو کا تیز پھل اس کی شہ رگ پر پھر گیا۔ چنانچہ لڑائی ہوتی ہے تو لوگ اسے فلم کا ایک منظر سمجھ کر دیکھ لیتے ہیں اور اس کے اختتام پر تالیاں بجا کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ اعصابی برانگیختگی اور جھلاہٹ کی یہ کیفیت صرف اِکا دُکا معرکوں تک محدود نہیں، بعض اوقات چھوٹے چھوٹے گروہوں میں، کبھی دودھ، کبھی زبان، کبھی بس اور کبھی کسی معمولی بات پر بلوے ہوتے ہی رہتے ہیں۔ میرے بمبئی کے قیام کے دوران میں ایسے دو تین بلوے ہوئے جن میں گولیاں بھی چلیں اور لوگ مارے بھی گئے یا زخمی ہوئے لیکن مجال ہے کہ شہر پر اس کا کوئی ناخوشگوار اثر مرتسم ہوا ہو۔ بس دوسرے روز اخبار کے کسی گوشے میں ایک چھوٹی سی خبر چھپ جاتی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں!

کسی زمانے میں بمبئی کو "عروسِ ہند" کے نام سے پکارا جاتا تھا اور اس کے کوچہ و بازار اپنی صفائی اور نفاست کے لئے مثالی حیثیت رکھتے تھے۔ یہی حال کراچی کا تھا لیکن کراچی جب مہاجرین کے سیلِ رواں کی زد میں آیا تو اس کی صفائی کے معیار کا رو بہ زوال ہو جانا ایک بالکل فطری امر تھا۔ دوسری طرف بمبئی کو کسی ایسے اچانک سیلاب سے نبرد آزما ہونا نہیں پڑا۔ پھر بھی وہاں اب غلاظت ہی غلاظت ہے۔ دراصل جب آبادی بڑھتی ہے تو غلاظت بھی بڑھ جاتی ہے۔ اب بمبئی میں آبادی پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو چکی ہے اور اس لئے جب ایک چھوٹے سے کمرے میں دس دس بارہ بارہ آدمی رہ رہے ہوں تو حفظانِ صحت کے جملہ اصولوں کا بآسانی منہ چڑایا

جا سکتا ہے بلکہ بمبئی میں تو کمرہ بجائے خود تعیش کی ایک صورت ہے ورنہ اس کی مخلوق کا ایک بڑا حصّہ تھڑوں، گلیوں، ٹیلوں اور گندے پانی کے نلوں میں رات گزارتا ہے۔ اس غلاظت نے جسم سے آگے بڑھ کر روح پر بھی حملہ کر دیا ہے چنانچہ اس کے بازاروں میں قطار اندر قطار وہ کوٹھڑیاں نظر آتی ہیں جن میں جسم بیچنے والیاں صبح سے شام تک کھلے بندوں راہگیروں کو پھانسنے کی مشق کرتی ہیں۔

اُس شام ہم نے بمبئی میں پہلی ہندوستانی فلم دیکھی۔ نام تھا —" پھر وہی دل لایا ہوں" فلم رنگین تھی اور فوٹوگرافی نہایت عمدہ! ہمارے لئے اس فلم میں جاذبِ نظر ایک بات یہ بھی تھی کہ اسے کشمیر میں فلمایا گیا تھا اور اس لئے جھیل ڈل اور گلمرگ کے خوبصورت مناظر ایک طویل مدت کے بعد دیکھنے کو ملے۔ ویسے فلم کا معیار بہت معمولی تھا۔ یہ ایک درمیانے درجے کی تفریحی فلم تھی۔ لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ شروع سے آخر تک اس کے مکالمے خالص اردو زبان میں تھے۔ اور تماشائی ان سے خوب خوب محظوظ ہو رہے تھے۔ انٹرول ہوا تو میں نے گردن موڑ کر تماشائیوں پر ایک نظر ڈالی۔ ان میں سے بیشتر پارسی اور گجراتی تھے جن کی شکل وصورت دیکھ کر وہم وگمان تک نہ ہو سکتا تھا کہ انہیں اردو زبان سے بھی شغف ہے لیکن وہ اردو کے مکالمے ہی نہیں بلکہ داغ اور غالب کے اشعار تک سمجھنے کے قابل تھے۔ بعض دوسری ہندوستانی فلموں کو دیکھنے کے بعد میرا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ ہندوستان کی قومی زبان ایک اور صرف ایک ہے اسے آپ اُردو کہہ لیں اور اگر اردو کے لفظ سے نفرت ہے تو ہندوستانی کا نام دے لیں۔ لیکن حقیقتاً یہی ایک بھاشا ہے جو ہندوستان میں امرتسر سے لے کر مدراس تک عام طور سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بہت سی ہندوستانی فلمیں جب شروع ہوتی ہیں تو جلی حروف میں اعلان کیا جاتا ہے کہ یہ ایک "ہندی فلم" ہے۔ چنانچہ فلم دیکھنے والا بھاری بھرکم سنسکرت الفاظ سننے کے لئے تیار ہو جاتا ہے لیکن فلم میں اردو کے اشعار اور نفیس اور شستہ اردو مکالمے سُننے کو ملتے ہیں میں نے ایک فلم پروڈیوسر سے سوال کیا کہ اگر حکومت فلم انڈسٹری والوں کو حکم دے کہ وہ آل انڈیا ریڈیو کی تقلید میں فلمیں اردو کی بجائے سنسکرت آمیز ہندی میں بنائیں تو ان کا ردِّعمل کیا ہوگا۔ میری بات سن کر وہ مسکرائے اور کہنے لگے کہ فلم تو اس جناتی زبان میں چلے گی نہیں۔ اس لئے ہم لوگ فلم کا کام چھوڑ کر کوئی اور دھندا شروع کر لیں گے۔ بے شک اب ہندوستان میں تامل، تیلگو اور ملیالم وغیرہ میں فلمیں بنانے کا رجحان بڑھ رہا ہے اور یہ درحقیقت آریائی تسلط کے خلاف دراوڑوں کی تحفظِ ذات کی

ایک کوشش ہے تاہم بحیثیتِ مجموعی ابھی تک اُردو فلموں ہی کا بول بالا ہے۔ لیکن ذکر "پھر وہی دل لایا ہوں" کا تھا۔ فلم جب ختم ہوئی تو ہم لوگ بڑے ادب سے کھڑے ہوکر ہندوستان کا قومی ترانہ سُننے لگے۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ لوگ ترانے کا احترام نہیں کر رہے تھے۔ چنانچہ ترانے کے خاتمے سے پہلے ہی سارا ہال خالی ہو گیا اور ہم ایک غیر ارضی مخلوق کی طرح بے حس و حرکت کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ عجیب بات ہے کہ اہلِ ہند کہنے کو تو وطن پرستی کے علم بردار ہیں لیکن اپنے ترانے اور قومی جھنڈے کے احترام سے گریز کرتے ہیں۔ اس روز کے بعد ہم نے قیامِ بمبئی کے دوران میں کوئی سات یا آٹھ ہندوستانی فلمیں دیکھیں۔ کئی فلموں کے بعد آدھا ترانہ سنایا گیا، کئی فلموں کے بعد ترانہ سنانے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی گئی لیکن اکثر ترانوں کے دوران ہی میں تماشائیوں نے ہال خالی کر دیئے۔ شروع شروع میں پاکستان کا بھی یہی حال تھا لیکن اب یہاں کے چھوٹے چھوٹے شہروں میں بھی ترانے کا احترام ہونے لگا ہے۔ بس عادت کی بات ہے!

یہ محض اتفاق ہے کہ ہمارے دورانِ قیام میں کوئی بہت عمدہ ہندوستانی فلمیں نہیں دکھائی جا رہی تھیں۔ "مغلِ اعظم" کی ان دنوں بہت دھوم تھی لیکن بعض قانونی الجھنوں کے باعث بمبئی سٹیٹ میں اس کی نمائش ممنوع تھی۔ "گمراہ" اور "تازن" جن کا بہت شہرہ تھا، اُتر چکی تھیں لیکن اختر الایمان صاحب کی توجہ سے ایک روز ہمیں کاردار سٹوڈیو کے پرائیویٹ سینما ہاؤس میں فلم گمراہ بطورِ خاص دکھائی گئی۔ اس کے مکالمے اختر الایمان نے لکھے ہیں اور ایک چھوٹا سا پارٹ بھی ادا کیا ہے۔ دونوں باتوں میں ایک فطری نفاست اور نکھار کا احساس ہوتا ہے۔ "گمراہ" بلاشبہ ایک بلند پایہ فلم ہے اور مغرب کی عمدہ فلموں کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہے۔ اُن دنوں جو ہندوستانی فلمیں دکھائی جا رہی تھیں ان میں بعض باتیں مشترک تھیں۔ مثلاً یہ کہ ان کہانیوں میں جذبہ بالخصوص محبت کا جذبہ غالب تھا۔ یہ بات ان فلموں کے ناموں سے بھی ظاہر تھی مثلاً "دل ایک مندر" "دل ہی تو ہے"، "پھر وہی دل لایا ہوں"، "دل دے کے دیکھو" اور اس طرح بعض دوسری فلموں میں دل کا لفظ مشترک تھا اور ان فلموں کے ایک بنیادی رجحان کا غماز تھا۔ پھر جہاں تک ان فلموں کے موضوع کا تعلق ہے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ایک عام ہندوستانی کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آج کی برق رفتار اور شکست و ریخت کی فضا میں سماجی شیرازہ بندی کا وہ عمل مجروح نہ ہونے پائے جس پر

ہندوستانی تہذیب کا ہمیشہ سے دارومدار رہا ہے۔ چنانچہ ان فلموں میں گھر کی بقا اور استحکام کا جذبہ بہت قوی تھا۔ شوہر اور بیوی کا بندھن، بہن اور بھائی کی محبت، ماں اور بچے کا رشتہ ــ یہ تمام چیزیں ایک مقدس ورثے کے روپ میں ابھری ہوئی نظر آتی تھیں اور فلم پروڈیوسر، نیز کہانی لکھنے والے نے ساری توجہ شکست و ریخت کے عمل کو روکنے پر صرف کر رکھی تھی۔ واپس پاکستان آ کر میں نے ازراہِ تجسس پاکستانی فلموں کے اشتہارات کی طرف نظر دوڑائی تو مجھے "انتقام" "بیکھے والی" اور "تیس مار خان" ایسے ناموں کا سامنا کرنا پڑا جو شکست و ریخت کے عمل کو ظاہر کر رہے تھے۔

شیکسپیئر نے ایک جگہ دنیا کو سٹیج سے تشبیہ دی ہے۔ بمبئی میں فلم کی صنعت اور فلم بینی کے شدید رجحان کو دیکھ کر میں نے سوچا کہ شیکسپیئر کی تشبیہ کا اطلاق بمبئی کی فضا پر بآسانی ہو سکتا ہے۔ فی الواقعہ بمبئی کی ساری آبادی کسی نہ کسی طرح فلم سے متعلق ہے۔ مثلاً اس کا ایک حصّہ تو فلمی صنعت کے مختلف شعبوں سے متعلق ہے اور باقی حصّہ فلم بینی کے عمل میں مبتلا ہے۔ بمبئی شہر بجائے خود ایک حوض کی طرح ہے جس میں لاکھوں کی تعداد میں مچھلیاں بند ہیں۔ شام کے قریب اس حوض کا پانی اس قدر گدلا ہو جاتا ہے کہ مچھلیوں کو سانس لینے کے لئے حوض کی سطح پر آنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ چنانچہ بمبئی کے باشندے سمندر کنارے، پارکوں، تفریح گاہوں، شراب خانوں، کلبوں مگر زیادہ تر سینما ہاؤسوں کی طرف بھاگنے لگتے ہیں۔ تفریح کا یہ عمل اہلِ بمبئی کے لئے ایک اہم ضرورت کا درجہ رکھتا ہے اور سینما ہاؤس تو بالخصوص جذبات کے اخراج کا کام دیتے ہیں۔ اعصابی تناؤ اور برق رفتاری کی اس فضا میں اگر ایک ہفتے کے لئے فلموں کی نمائش بند کر دی جائے تو مجھے یقین ہے کہ اس شہر کی آدھی مخلوق اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے۔

اگلے روز صبح ہی صبح ایک نوجوان راجہ صاحب کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ راجہ صاحب نے بڑے تپاک سے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا ورنہ وہ عام طور سے اپنی جھولا نما کرسی کو چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔ خود مہمان ان کی راکنگ چیئر کے ٹکنے یا تیز تیز چلنے ہی سے راجہ صاحب کے موڈ کے بارے میں اندازہ کرتے ہیں۔ مثلاً اگر مہمان کی آمد پر کرسی میں زلزلہ سا آ جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مہمان سامنے بچھے ہوئے صوفے کے آخری کونے میں بخوشی بیٹھ سکتا ہے۔ اور اگر کرسی دفعتاً رک جائے اور راجہ صاحب کی زبان کا نشتر ناتھ کو اس کے سلسلۂ نسب کے بعض نازک مقامات

سے آگاہ کرنے لگے تو مہمان فوراً جان لیتا ہے کہ صورتِ حال خطرناک ہے۔ بہرحال راجہ صاحب نے نووارد کا تعارف کرایا۔ معلوم ہوا کہ ان کا نام رینو مکرجی ہے اور وہ مشہور فلم پروڈیوسر مکرجی کے صاحبزادے ہیں۔ رینو کی عمر بمشکل چوبیس پچیس برس ہوگی لیکن انہوں نے فلمیں بنانے کا کام ابھی سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے۔ رینو مکرجی راجہ صاحب کو سنسر بورڈ کے دفتر میں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ میں نے کہا مجھے بھی ساتھ لے جایئے۔ چنانچہ ہم تینوں ایک ٹیکسی لے کر چل پڑے۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ رینو مکرجی نرے فلم پروڈیوسر نہیں بلکہ ایک "انٹلکچوئل" بھی ہیں۔ سارا راستہ ہم فرد اور سوسائٹی کے ربطِ باہم پر باتیں کرتے رہے۔ دراصل بمبئی میں ہجوم کے سیلاب کو دیکھ کر سب سے اہم سوال یہی ابھرتا ہے کہ کیا فرد محض اس سیلاب کی ایک لہر ہے یا اس کی کوئی الگ حیثیت بھی ہے۔ باتوں کے دوران ہم نے بمبئی کی نسلوں کے پیدا ہونے اور پھر غائب ہوجانے کے عمل کو گھاس کے اس میدان سے تشبیہہ دی جس میں سے ایک معین وقفے کے بعد گھاس کاٹ لی جاتی ہے اور نیچے سے نئی گھاس پھوٹ آتی ہے۔ جس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ یہاں بمبئی میں فرد تو کوئی چیز نہیں۔ اصل چیز تو نسل در نسل کا وہ سلسلہ ہے جس کی حیثیت ازلی و ابدی ہے۔ بہرحال ٹیکسی کے اس سفر میں بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں۔ پھر ہم دفتر پہنچ کر انتظار گاہ میں جا بیٹھے۔ وہاں رینو کے والد مکرجی پہلے ہی سے بیٹھے تھے۔ اُن سے ملاقات ہوئی۔ مکرجی بڑے ہنس مکھ انسان ہیں۔ انہوں نے اس روز گاندھی کیپ پہن رکھی تھی۔ راجہ صاحب نے اپنا منہ میرے کان کے قریب لے جاکر بتایا کہ مکرجی نے تازہ تازہ سر پر استرا پھرایا ہے (جو غالباً ہندو مذہب میں کسی قریبی عزیز کی موت پر ایک رسم کی حیثیت رکھتا ہے) اور اب اسے چھپانے کے لئے کانگریس پرستی کے عمل میں مبتلا ہیں۔ ہمیں وہاں بیٹھے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ایک لمبے تڑنگے مضبوط جسم کے آدمی کمرے میں داخل ہوئے اور داخل ہوتے ہی انہوں نے محفل کو زعفران زار میں تبدیل کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ان کا نام تیواڑی صاحب ہے اور وہ بمبئی کے ایک مشہور فلم پروڈیوسر ہیں۔ تیواڑی بڑے باغ و بہار آدمی ہیں۔ تکلف اور تصنع کو مطلق پسند نہیں کرتے اور ان کے دل اور زبان کے درمیان شاید کوئی باریک سا پردہ بھی حائل نہیں۔ تیواڑی صاحب منٹو اور ڈبلیو زیڈ احمد کے یارِ غار رہے ہیں۔ منٹو کا ذکر کرتے ہوئے تو ان کی آنکھوں بھیگ گئیں اور وہ بڑی دیر تک مجھے ان کی باتیں سناتے رہے۔ یکایک

مجھے یاد آیا کہ میں نے منٹو کے بعض مضامین اور افسانوں میں شاید تیواڑی کا نام بھی پڑھا ہے۔ ڈبلیو زیڈ احمد کو وہ اپنا محسن اور دوست سمجھتے ہیں۔ ان کی تعریف کرتے ہوئے بہت سنجیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے کہ اگر احمد صاحب اپنا دستِ کرم میری طرف نہ بڑھاتے تو میں کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔ اس روز اور اس روز کے بعد جب بھی فلم انڈسٹری سے وابستہ کسی شخص سے ملاقات ہوئی، اُس نے احمد صاحب کا نام ضرور لیا اور نہایت عزت اور احترام کے ساتھ! حیرت ہے کہ احمد صاحب جو آج تک بمبئی کے حلقوں میں ایک عظیم فلم پروڈیوسر کی حیثیت سے یاد کئے جاتے ہیں، پاکستان آتے ہی اپنی اس حیثیت سے دست کش کیوں ہو گئے اور انہوں نے فلمی دنیا میں کیوں کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔

بمبئی، دوسری اشیاء کے علاوہ کتابوں کا بھی ایک بہت بڑا مرکز ہے اور میں بعض کتابوں کی دکانوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ایسے میں دور آفریدی صاحب نے اپنی خدمات پیش کر دیں اور دوسری صبح مجھے آ کر لے گئے۔ پہلے تو ہم دو تین دکانوں میں اردو کتب کا جائزہ لیتے رہے اور پھر اپنی منزلِ مقصود یعنی مکتبہ جامعہ جا پہنچے۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی دکان ہے لیکن اس کا کاروبار بہت وسیع ہے اور کاروبار ہی کی طرح اس کے مالک کا دل بھی بہت کشادہ ہے جب انہیں معلوم ہوا کہ پاکستان سے آیا ہوں تو بڑی محبت سے پیش آئے اور بڑی دیر تک ان مشکلات کا ذکر کرتے رہے جو پاکستانی کُتب کے حصول کے سلسلے میں انہیں درپیش تھیں۔ میں مکتبہ جامعہ کی اس چھوٹی سی دکان میں بیٹھا ہندوستان میں چھپی ہوئی کتب کے ڈھیر میں سے اپنے مطلب کی کتابیں تلاش کر رہا تھا کہ مجھے السلام علیکم کا نعرہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی کسی نے نووارد سے میرا تعارف کرا دیا۔ دراصل میرے یہاں آتے ہی ایک قاصد روانہ کر دیا گیا تھا جو اب مہر محمد خان شہاب صاحب کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ مہر شہاب صاحب اُردو کے علمی حلقوں میں بڑی اچھی طرح متعارف ہیں۔ بزرگ آدمی ہیں۔ شرافت اور نفاست ان کی ایک ایک بات سے مترشح ہے۔ ان کا اصل میدان تحقیق ہے۔ جن احباب نے "برہان" میں ان کے تحقیقی مقالے پڑھے ہیں وہ مہر صاحب کے وسیع مطالعہ کی یقیناً داد دیں گے۔ ابھی ہم بیٹھے باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک پریشان حال، بوکھلائے ہوئے نوجوان دکان میں داخل ہوئے۔ دور آفریدی صاحب نے کہا "ان سے ملئے! باقر مہدی صاحب!" میں اٹھ کر انہیں ملا لیکن انہوں نے کسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ دکان کے اندر جا کر دور آفریدی صاحب سے باتیں کرنے لگے۔ معلوم ہوا کہ

دور آفریدی صاحب نے انہیں بتادیا تھا کہ میں آج یہاں آؤں گا۔ چنانچہ وہ مجھے ملنے چلے آئے تھے لیکن کیا مجھے؛ پھر وہ روٹھے ہوئے سے کیوں ہیں؛ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ویسوویس یا تو چپ رہتا ہے یا پھر اپنا سارا لاوا ایک ہی بار اُگل دیتا ہے۔ کہاں تو یہ بے اعتنائی اور خود فراموشی اور کہاں یہ عالم کہ ہم دکان سے باہر آئے اور باقر مہدی صاحب نے نہایت گرمجوشی سے باتیں شروع کردیں جدید اُردو نظم سے انہیں بے پناہ لگاؤ ہے اور وہ اتنی کتابوں کے ناموں سے واقف ہیں کہ میں دل ہی دل میں انہیں ایک چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا کا نام دے رہا تھا لیکن بڑے پُر خلوص اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ ہاں ذرا منزل تک چہل قدمی کرتے ہوئے آتے ہیں۔ باقر مہدی صاحب مجھے ایک انگریزی کتب کی دکان میں لے گئے۔ اور وہاں میں نے ان کے مشورے سے بارہ تیرہ کتابیں خریدیں۔ باہر نکلے تو باقر صاحب نے مجھے بتایا کہ ظ انصاری صاحب یہیں قریب ہی رہتے ہیں کیوں نہ ان سے مل لیا جائے۔ میں خود بھی ظ انصاری سے ملنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ہم لفٹ کے ذریعے ان کے فلیٹ تک جا پہنچے۔ گھنٹی بجائی تو انصاری صاحب نے دروازہ کھول دیا۔ بڑے تپاک اور خندہ پیشانی سے ملے اور ہم تقریباً ایک گھنٹہ وہاں بیٹھے مختلف موضوعات پہ باتیں کرتے رہے۔ ظ انصاری صاحب کے چھوٹے سے فلیٹ میں روسی زبان کے اخبارات بکھرے پڑے تھے۔ وہ خود روسی زبان کے ماہر بھی ہیں اور ایک جانے پہچانے نقّاد بھی!

اس سے اگلے روز میں کرشن چندر کو ملنے ان کی رہائش گاہ (گورونواس) پہ گیا۔ کرشن چندر سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ تصویر انسان کے جسم کو نہیں بلکہ اس کی روح کو پیش کرتی ہے کیوں کہ کرشن چندر کی جو تصویریں دیکھنے کو ملی تھیں، گوشت پوست کے لبادے میں وہ ان سب سے مختلف تھے۔ قد تو خیر یوں بھی ان کا لمبا نہیں لیکن اب کہ ان کا جسم موٹاپے کی طرف مائل ہے تو یہ قد کچھ اور بھی دھرتی سے قریب ہو گیا ہے۔ سر کو کسی زمانے میں سرکش لہروں نے ضرور تختۂ مشق بنایا ہوگا لیکن اب سمندر پیچھے ہٹ چکا ہے اور اس کے نیچے سے ایک چٹیل میدان نمودار ہو گیا ہے۔ سنا تھا کہ بحر اگر بحر نہ رہے تو بیابان میں بدل جاتا ہے۔ آج یہ بات بالکل سچّی دکھائی دی۔ لیکن کرشن چندر اس محبت سے ملے جیسے ہم جنم جنم سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ اور پھر جب باتیں شروع

ہوئیں تو بات بات سے کرشن چندر کی ذہانت اور ان کا نکھرا ہوا ذوقِ مزاح مترشح تھا۔ مجھے بمبئی کے قیام کے دوران میں کرشن چندر سے تین چار بار ملنے کا اتفاق ہوا اور ہر بار مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک متجسس اور مضطرب روح سے مصروفِ گفتگو ہوں۔ وہ ہر بات کے بارے میں سراپا ذوقِ استفسار تھے۔ خدا اور کائنات، زندگی اور موت، مادہ اور غیر مادہ اور ایسے ہی دوسرے لاینحل مسائل ان کے سامنے تھے۔ کہنے لگے کہ چالیس برس کی عمر تک تو میں حتمی فیصلے کرتا اور انہیں حرفِ آخر سمجھتا رہا لیکن اس کے بعد اب تیقن بتدریج رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ کسی بھی شے کے بارے میں وثوق کے ساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں رہا۔ کائنات اس قدر پُراسرار ہے اور اس میں امکانات کا میدان اس درجہ وسیع ہے کہ انسان کسی ایک دھاگے سے خود کو منسلک نہیں رکھ سکتا۔ وہ مجھ سے میرا فلسفۂ حیات پوچھنا چاہتے تھے اور وجود و عدم کے مسائل پر گفتگو کرنے کے بھی خواہاں تھے لیکن وقت کم تھا۔ یہ سب ممکن ہی نہ ہو سکا۔ ویسے کرشن چندر صاحب سے ان ملاقاتوں میں ذاتی فلسفے کے بارے میں نہ سہی، اور ہزار مسائل کے بارے میں مفصل باتیں ہوئیں۔ وہ ہندوستان میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں سخت پریشان تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر تعصب اور انتقامی روش کا یہی عالم رہا تو لکھنے کی زبان زیادہ دیر تک زندہ نہ رہ سکے گی۔ ویسے آج ہندوستان میں اردو رسم الخط کا مستقبل تاریک ہو چکا ہے۔ درآنحالیکہ اس کو پڑھنے والوں کی تعداد ابھی کچھ ایسی کم نہیں ہوئی مثلاً پچھلے دنوں ہندوستان سے ایک اردو اخبار بلٹز نکلا جس کی اشاعت دیکھتے ہی دیکھتے دس ہزار تک پہنچ گئی۔ کرشن چندر صاحب نے مجھے بتایا کہ اس وقت بلٹز کی مانگ پینسٹھ ہزار کے لگ بھگ ہے لیکن توسیعِ اشاعت کے لئے اسے حکومت سے اجازت لینا ضروری ہے۔ ہندوستان میں اُردو زبان کی مقبولیت کا اندازہ اسی بات سے لگائیے کہ مرزا غالب کا دیوان دیوناگری لپی میں چھپا تو اس کی سوا لاکھ کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ جب افسانے اور نظمیں اردو رسم الخط میں چھپتی ہیں تو کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوتیں لیکن جیسے ہی انہیں دیوناگری لپی میں منتقل کر دیا جاتا ہے تو ہاتھوں ہاتھ بک جاتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان دراصل اردو ہے۔ اہلِ ہند کو صرف اُردو کے لفظ اور اردو رسم الخط سے چڑ ہے۔ سو ان دو چیزوں کا اب خدا ہی نگہبان ہے۔

ہمیں بمبئی میں آئے ہوئے چار پانچ روز گزر چکے تھے لیکن ابھی تک ہم نے "پیشۂ وزِ تیاج

کی طرح بمبئی کی مشہور سیر گاہوں کی سیر نہیں کی تھی۔ مینا اور سیتم نے جوہو، تراپور والا مچھلی گھر، مالابار ہل اور انڈیا گیٹ وغیرہ کا نام سن رکھا تھا اور وہ بضد تھے کہ ہمیں یہ جگہیں دکھایئے۔ میری بیوی کسی ایک سٹوڈیو میں شوٹنگ کا منظر دیکھنا چاہتی تھی اور اگرچہ ہمارے پاس زادِ راہ یعنی روپیہ بہت کم تھا تاہم نسوانی جبلت کا یہ تقاضا تھا کہ بمبئی کی بعض مشہور دکانوں میں اگر کچھ اور نہیں تو ذرا چہل قدمی ہی کر لی جائے۔ چنانچہ اپنے ساتھیوں کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے میں نے ایک پورا دن ان کے لئے وقف کر دیا اور ہم ایک صبح ٹیکسی لے کر نکل پڑے اور سارا دن گھومتے رہے۔ جوہو عام طور سے ساحل سمندر کا ایک نہایت خوبصورت منظر پیش کرتا ہے لیکن اس روز لہریں کچھ زیادہ پُرجوش نہیں تھیں۔ آج سے بیس برس پہلے میں نے یہیں جوہو کے کنارے ایک خوبصورت شام گزاری تھی۔ برسات کا موسم تھا اور سمندر کا مزاج چڑچڑا سا ہو گیا تھا۔ پھر یکایک ایک بارانی طوفان کی زد میں آ کر سمندر بدمزاج ہو گیا اور اس کی لہروں نے کہرام سا برپا کر دیا اور میں نے کچھ دیر طوفان کا نظارہ کرنے کے بعد بھاگ کر جوہو کے ایک ریسٹوران میں پناہ لے لی۔ ریسٹوران کے بوڑھے پارسی مالک نے میری بڑی آؤ بھگت کی (شاید اس لئے کہ اس وقت ریسٹوران میں میرے سوا اور کوئی گاہک موجود نہیں تھا) اور بڑی دیر تک برلن پر روسی یلغار کی باتیں کرتا رہا لیکن آج دھوپ چمک رہی تھی۔ لہریں پیچھے ہٹی ہوئی تھیں اور ساحل کی ریت دُور دُور تک پھیلی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جوہو کا یہ روپ بالکل اس عورت کا سا تھا جس کا سہاگ لُٹ چکا ہو اور جس نے اپنے سارے جذبات کو سربمہر کر دیا ہو۔ مالابار ہل سے میں نے سمندر کو ایک شکن آلود نیلی چادر کی طرح بچھے ہوئے دیکھا اور ایک سچے سیاح کی طرح آہِ سرد بھر کر اس کا مقابلہ انسان کی حقیر اور فانی زندگی سے کرتا رہا اور چند لمحے ٹکٹکی لگائے سمندر کو یوں گھورتا رہا جیسے کوئی فاتحہ پڑھ رہا ہو۔ دراصل آج کی تیز رفتاری اور میکانکی زندگی میں سیاحت بھی فاتحہ خوانی کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ چنانچہ ایک سیاح کی حیثیت میں میرا یہ فرض تھا کہ میں سیاحت کے جملہ مقتضیات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ یہی کچھ میں نے کیا۔ مالابار ہل کے بعد ہم نے تراپور والا مچھلی گھر دیکھا جس میں سب سے دلچسپ نمونہ اس مچھلی کا تھا جس پر "شان اللہ" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے۔ مچھلی گھر کی نیم تاریک فضا میں بعض مچھلیاں رنگ برنگ تتلیوں کی طرح اُڑتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں سے ہم بعض دوسری جگہوں کی سیر کے لئے گئے اور آخر میں وکٹوریا ٹرمینس کے قریب ایک بہت بڑے بازار کی دکانوں کا جائزہ لینے

گے۔

بمبئی کی دکانیں ہر قسم کے سامان سے لدی پڑی ہیں لیکن گاہکوں کی تعداد بہت کم ہے۔ پھر ایک یہ دلچسپ بات بھی تھی کہ ان دکانوں کا بیشتر مال ہندوستان کا اپنا تیار کردہ تھا۔ ہمیں کھلونوں کی ایک بہت بڑی دکان میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں سینکڑوں قسم کے خوبصورت کھلونے قطار اندر قطار رکھے تھے لیکن ان میں ایک کھلونا بھی ایسا نہیں تھا جسے درآمد کیا گیا ہو۔ ویسے ہندوستان کے اس سفر کے دوران میں مجھے اس بات کا شدید احساس ہوا کہ وطن پرستی کے جذبے کے تحت یہاں درآمد کی وہ روایت وجود میں نہیں آئی جس کا پاکستان داعی اور علم بردار رہا ہے۔ ہندوستان میں درآمد کے میلان کی مذمت اس بات سے بھی عیاں ہے کہ یہاں سڑکوں پر بیشتر چھوٹی کاریں نظر آتی ہیں اور یہ سب ہندوستان کے اپنے کارخانوں میں تیار کی گئی ہیں جبکہ پاکستان میں بڑی بڑی درآمد کی ہوئی کاروں کی ریل پیل ہے۔ البتہ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وطن پرستی کے جذبے کے باوصف ہندوستانی کاروں میں سے کسی ایک پر بھی دیوناگری رسم الخط کی نمبر پلیٹ آویزاں نہیں تھی۔ اگر سیاح محض کاروں اور سائن بورڈوں ہی کا نظارہ کرکے واپس چلا جائے تو وہ وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکے گا کہ وہ لندن میں قیام پذیر رہا یا بمبئی میں! اس کے برعکس لاہور کی مال روڈ پر نہ صرف یہ کہ دکانوں کے انگریزی زبان میں لکھے ہوئے بڑے بڑے سائن بورڈوں کے سائے میں اردو کی چھوٹی چھوٹی تختیاں بھی نمودار ہوگئی ہیں بلکہ کبھی کبھی کاروں کے سیلِ رواں میں اردو نمبر پلیٹ والی کوئی کار بھی دکھائی دے جاتی ہے۔ مگر ذکر بمبئی کا تھا۔ بمبئی میں اشیاء کی قیمتیں خاصی کم ہیں۔ بالخصوص کپڑا بہت سستا ہے اور ہمارے یہاں کے کپڑا بیچنے والوں کے لئے ایک لمحۂ فکریہ مہیا کرتا ہے[1]۔ یہی حال سینما کے ٹکٹوں کا ہے۔ "مراٹھا مندر" یا شاید ایک آدھ اور سینما ہاؤس میں ٹکٹ کی قیمت وہی تھی جو پاکستان میں رائج ہے اور اس کی وجہ بھی محض یہ تھی کہ یہ سینما ہاؤس محلوں کی طرح خوبصورت اور آراستہ ہیں اور تماشائیوں کو بہت سی سہولتیں مہیا کرتے ہیں ورنہ عام طور سے وہاں سینما کے ٹکٹوں کی قیمت بہت کم ہے۔ بازار سے ایک آدھ کھلونا اور دو ایک ساڑھیاں خریدنے کے بعد ہم نے ایک ایرانی ہوٹل میں مدراسی کھانا کھایا لیکن اس کا ذکر میں اس

---

[1] یہ ۱۹۶۳ء کی بات ہے، ورنہ آج صورتِ حال بالکل بدل چکی ہے (و۔ و)

لئے نہیں کروں گا کہ اس کے تصور ہی سے مجھے ابکائی آنے لگتی ہے۔

کھانے سے فارغ ہوکر ہم ایک فلم سٹوڈیو میں چلے گئے۔ سٹوڈیو کا نام اب یاد نہیں لیکن ہمارے پاس راجہ جی ایک "کھُل سِم سِم" کی حیثیت میں موجود تھے اور انہیں دیکھتے ہی تمام سٹوڈیوز کے دروازے از خود کھُل جاتے تھے۔ نہ بھی کھُلتے تو ان کے سامنے کس طرح جم کر کھڑے رہ سکتے تھے۔ سیٹ پر اس روز اشوک کمار ایک سادھو کے لبادے میں ملبوس کھڑے دکھائی دیئے ان سے ملاقات ہوئی۔ غالباً "چترلیکھا" کی شوٹنگ ہو رہی تھی اور اس کے لئے بڑے بڑے غار بنائے گئے تھے۔ پاس ہی ایک بہت بڑا بُت پڑا تھا اور نصف درجن ایکٹروں نے سادھوؤں کا لباس پہن رکھا تھا۔ یہاں سے نکلے تو تھک ہار چکے تھے۔ چنانچہ سیدھے راجہ صاحب کی رہائش گاہ پر پہنچے۔ وہاں میوزک ڈائریکٹر مسٹر چندن انتظار میں کھڑے تھے۔ راجہ صاحب نے کہا لیجیئے ابھی ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی کرم خوردہ بیاض لے کر راکنگ چیئر میں نیم دراز ہو گئے، چندن صاحب نے ہارمونیم کو چھیڑا اور انتہائی لطیف اور سریلی آواز میں گیت اور غزلیں سنانے لگے۔ چندن کی آواز میں ایک قدرتی لوچ ہے۔ آواز پر ان کی گرفت بہت کڑی ہے اور گیت کی جذباتی فضائیں ڈوب کر گاتے ہیں۔ ادھر فلموں میں راجہ صاحب کے گیت اور غزلیں ان دنوں بہت مقبول ہو رہی ہیں اور وہ بیانگ دہل اعلان کرنے لگے ہیں کہ کسی فلم میں گیت کے پچاس ہزار ضرور لیں گے۔ سُنا ہے ساحر لدھیانوی ایک لاکھ لیتے ہیں۔ دروغ برگردنِ راجہ۔

اس سے اگلے روز اخترالایمان صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ میں "گرداب" کے شاعر پر "کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے" کا لیبل چسپاں کروں گا لیکن جب میں ان سے ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کا غم کہیں دُور نیچے ذات کی گہرائیوں میں دبکا پڑا ہوگا ورنہ عام زندگی میں تو وہ بڑے ہنسوڑ اور خوش باش انسان ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ جب کچھ باقی نہ رہے تو ہنسی امڈ آتی ہے اس مثل کا اطلاق غالب پر تو ہو سکتا ہے اخترالایمان پر ہرگز نہیں۔ مادی زندگی میں اختر صاحب پچھلی صف میں نہیں رہے۔ لیکن شاید ایک گہری کسک ان کی ذات کی پنہائیوں میں تاحال موجود ہے اور یہی کسک انہیں شعر کہنے پر اکساتی ہے۔ اختر صاحب نے مجھے اپنے تازہ مجموعۂ کلام "یادیں" کی ایک جلد عطا کی۔ اس کتاب پر انہیں ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے پانچ ہزار

روپے انعام مل چکا ہے۔ باتوں باتوں میں انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے پاس میراجی کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے دو مجموعے موجود ہیں۔ میری خواہش کے احترام میں انہوں نے مجھے یہ دونوں مجموعے دکھائے۔ اِدھر کچھ عرصہ سے میراجی کی نظموں کی مانگ مسلسل بڑھ رہی ہے، اور اہلِ ذوق کا مطالبہ ہے کہ میراجی کا شعری سرمایہ جلد ہی کتابی صورت میں سامنے آجائے۔ خوشی کی بات ہے کہ اختر الایمان صاحب کو اس مطالبے کی شدّت کا احساس ہے اور وہ بہت جلد ان مجموعوں کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

بمبئی میں ہمارے قیام کی مدّت اب ختم ہونے کو تھی اور دلوں پر اُداسی مسلط ہونا شروع ہوگئی تھی اور پھر وہ صبح نمودار ہوئی جس سے ہم خوف زدہ تھے۔ اس روز ناشتے کی میز پر بھی مُردنی چھائی رہی۔ راجہ مہدی کسی گہری سوچ میں مستغرق ناشتہ کرنے کے بجائے زور زور سے اپنے گالوں پر شیو کا برش رگڑتے رہے۔ صفیہ اور مینا سامان باندھتی رہیں۔ البتہ میں اور سلیم کسی انتقامی جذبے کے تحت بے تحاشا کیلے کھاتے رہے۔ پھر ٹیکسی منگائی گئی اور مسافر اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگئے۔ بمبئی سنٹرل کے طویل و عریض پلیٹ فارم پر ڈی لکس ٹرین رکی تو ہم بجھے ہوئے دلوں کے ساتھ اس میں جاکر بیٹھ گئے۔ پلیٹ فارم پر میرے کئی ایک احباب کھڑے تھے جو مجھے الوداع کہنے کے لئے آئے تھے۔ ان ہی میں راجہ مہدی بھی تھے جن کی یاد میرے دل میں ایک انمول خزانے کی طرح محفوظ ہے اور جو اب خاصے مغموم نظر آرہے تھے۔ تب دفعتاً گاڑی نے سیٹی بجائی اور حرکت میں آگئی۔ بے اختیار ہمارے ہاتھ الوداعی سلام کے لئے بلند ہوئے۔ پھر تیز ہوتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی میں سے میں نے دیکھا کہ بکھرے ہوئے چہروں کے ہجوم میں راجہ مہدی کا چہرہ ایک مشعل کی طرح چمکا اور پھر گم ہوگیا۔ ملاقات ختم ہوگئی۔ دفعتاً پاتال سے تاریکی کی ڈائن ایک غلیظ سی انگڑائی لے کر اٹھی اور اس نے آگے بڑھ کر اپنے کالے چکٹ دامن سے دیوار پر لکھے ہوئے سارے روشن الفاظ مٹا دیئے۔

پس منظر

شامِ دوستاں آباد! — یہ کتاب کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں۔ مَیں نے کبھی سوچا تک نہ تھا کہ یہ غیر رسمی مضامین جو پچھلے پچیس سالوں کے دوران لمبے لمبے وقفوں سے نازل ہوئے، ایک دن کتابی صورت میں مرتب ہو کر میرے سامنے آ جائیں گے۔ مگر اب کہ ایسا ہو گیا ہے تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرے سامنے تا حدِ نظر ایک شامِ دوستاں آباد ہے اور مَیں جب چاہوں دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اس شام کے ایوان میں داخل ہو سکتا ہوں اور پھر شام کے باسیوں سے ہم کلام ہونے کی سعادت بھی حاصل کر سکتا ہوں۔ ان باسیوں میں سے کچھ تو بفضلِ خدا زندہ ہیں (ان زندہ ہستیوں میں انسانوں کے علاوہ تصویریں اور کتابیں بھی شامل ہیں) اور کچھ اب اس جہانِ فانی کو چھوڑ کر جا چکے ہیں مگر "شامِ دوستاں" میں بڑے التزام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور ہر دم تازہ اور شاداب نظر آتے ہیں۔ میرے لئے یہ سب لوگ وہ زندہ و درخشندہ لمحے ہیں جنہیں میں ہر شام یادوں کی مالائیں پرو کر اپنے گلے میں ڈالتا ہوں اور پھر شام کے آنگن میں تا دیر کسی گیلی لکڑی کی طرح سُلگتا ہوں کہ جو مزہ سلگنے میں ہے وہ نہ تو چوبِ خشک کے شعلوں میں ہے اور نہ بُجھتے ہوئے انگاروں کی راکھ میں۔

یوں بھی شام میرے لئے ایک دیرینہ دوست کی حیثیت رکھتی ہے اور میں نے اپنی زندگی کی بہترین گھڑیاں اس دوست ہی کی معیت میں گزاری ہیں۔ میں نے شام کو اس کے ہر رنگ اور روپ میں دیکھا ہے — اُداس بھی اور خوش بھی، گرد میں لت پت بھی اور موتیے کے پھُولوں کی سیج پر نیم دراز بھی، غصّے سے لال بھبھوکا بھی اور ایک سادھو کی طرح مہر بہ لب بھی۔ میں نے

شام کو ہنس ہنس کر بے حال ہوتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور کسی روگی کی طرح چپکے چپکے آنسو بہاتے ہوئے بھی۔ اور کبھی کبھی تو میں نے شام کو ایک ایسا کندن سا بدن پہنے ہوئے بھی دیکھا ہے کہ مجھے ڈر لگا ہے کہیں کوئی میلا ہاتھ اسے داغدار ہی نہ کر دے:

شام کے کھیتوں میں ننگے پاؤں چلنا چاہیئے

ہر طرف پھولوں کا سونا ہے یہاں بکھرا ہوا

اور میں نے شام کے ان تمام تابندہ یا سلگتے ہوئے لمحوں کو اپنے دل کی مٹھی میں محفوظ کر لیا ہے۔ ہر روز جب سورج ڈھلتا ہے تو میں جلدی جلدی تیار ہو کر دُور کھیتوں میں نکل جاتا ہوں اور پھر کچی سڑک کو چھوڑ کر بل کھاتی ہوئی نٹ کھٹ پگڈنڈیوں کی دنیا میں کھو جاتا ہوں۔ اب میرے چاروں طرف حدِ نظر تک لہلہاتے ہوئے کھیتوں کی چادر بچھی ہے اور اس چادر پر لاکھوں کروڑوں پھول شام کی آمد کے منتظر ہیں۔ میں بھی پجاریوں کے اس انبوہ میں شامل ہو جاتا ہوں اور پھر قبلہ رُو کھڑے ہو کر سورج کے ڈوبنے کا انتظار کرتا ہوں۔ ایسے میں مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں کسی معبد میں کھڑا ہوں۔ ابھی سنکھ دہائی دے گا کوئی پائل کھنکے گی اور پوجا پاٹ کا آغاز ہو جائے گا۔ اوپر آسمان کا رنگ تیزی سے بدلتا ہے۔ زردی کی جگہ سفیدی لے لیتی ہے۔ پھر اس سفیدی پر ابر پاروں کے بڑے بڑے دھبے ابھرتے ہیں اور جلد ہی یہ دھبے سُرخ ہونے لگتے ہیں۔ پھر جونہی سورج افق کی پہاڑیوں کے اس پار زمین بوس ہوتا ہے تو یہ دھبے تمتاتے ہوئے رخساروں کی طرح لَو دینے لگتے ہیں اور تب ان کی لَو زمین پر بکھرے ہوئے کروڑوں پھولوں کی آنکھوں میں اُتر آتی ہے۔ اس کے بعد میں کہہ نہیں سکتا کہ زمین اور آسمان میں کوئی فرق رہ بھی جاتا ہے یا نہیں۔ سُرخ و کبود بدلیوں کا عکس سرخ و کبود پھولوں پر اترتا ہے تو یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ زمین ہی آئینہ ہے جس میں آسمان کا عکس اتر آیا ہے یا آسمان کے آئینے میں دھرتی منعکس ہو رہی ہے۔ میں کسی کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر اس سارے منظر کو خود میں جذب کرتا ہوں۔ اسے مشروب کی طرح پیتا ہوں اور پھر دیکھتے دیکھتے اس سلگتے ہوئے منظر کا حصہ بن جاتا ہوں اور تب یادوں کی پوٹلیاں کسی غیبی ہاتھ کی مدد سے کھلتی ہیں اور میری شام دوستاں آباد ہو جاتی ہے:

سلونی سی اک شام

اور لاکھ رنگوں کی جوالا میں بھیگا ہوا کوئی لمحہ
انگوٹھی کے پاتال میں اک نگینے کے مانند ہنستی ہوئی کوئی ساعت
چمکتا ہوا وہ سماں جب کسی ڈولتے پل کو جھولا بنا کر لجا کر
عجب میٹھی نظروں سے میری طرف تُو نے دیکھا

یہ ہنستی ہوئی ساعت ماضی کے چاک سے اپنی جھلک دکھاتی ہے اور میرے دِل کے آنگن میں اجالا کر دیتی ہے۔ انگوٹھی بجائے خود ایک نازک اور لطیف سے بندھن کا اعلامیہ ہے اور اس کے پاتال میں چمکتا ہوا نگینہ ہی ہنستی ہوئی ساعت ہے۔ اس ساعت کو گزرے جیسے صدیاں بیت گئیں لیکن ہر روز جب شام ایک انگوٹھی کی طرح میرے ہاتھ پر چمکتی ہے تو بندھن کا یہ لمحہ زندہ و تابندہ ہو کر میرے سامنے آ جاتا ہے:

شام ہوئی ہے
شہر کے اندر مومی شمعیں
ڈرتے ڈرتے اپنی پیاسی آنکھوں کے پٹ کھول رہی ہیں
اور آفاق کی کالی چھت سے
تاروں کی سُوجی ہوئی آنکھیں جھانک رہی ہیں۔

عجیب سا منظر ہے۔ ایک طرف ستاروں کی آنکھیں ہیں جو ایک طویل شب بیداری کے باعث سُوجی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف مومی شمعوں کی آنکھیں ہیں جو ایک طویل نیند کے بعد بیدار ہو رہی ہیں مگر شام ان سُوجی ہوئی اور نیم بیدار آنکھوں کے درمیان ایک لرزتے ہوئے بے نام لمحے کا دوسرا نام ہے۔ یہ لمحہ نیند اور بیداری کا سنگم ہے۔ سنگم جہاں رُک کر انسان نے ہمیشہ خواب ہی دیکھے ہیں۔ آنے والی ساعتوں کے خواب یا گزرے ہوئے موسموں کے خواب! میں جب بھی شام کے حضور پہنچا ہوں تو میں نے گزرے ہوئے موسموں ہی کے خواب دیکھے ہیں۔ آپ انہیں "یادیں" کا نام بھی دے سکتے ہیں، اور یہ خواب اس طور نمودار ہوتے ہیں جیسے آسمان کے نیلگوں

پردے کے نیچے سے بڑے بڑے ابر پارے ظاہر ہو جائیں۔ مگر یہ ابر پارے گدلے اور غلیظ نہیں بلکہ سنہری کشتیوں کی طرح اُجلے اور سبک خرام ہوتے ہیں اور پھر میں ان سنہری کشتیوں میں بیٹھے ہوئے اپنے دوستوں کے چہروں کو دیکھتا ہوں اور یادوں کی برکھا میں پوری طرح بھیگ جاتا ہوں۔

میرے لئے "شامِ دوستاں" ایک انجمن ہے۔ جس کا میں ایک اعزازی رُکن ہوں۔ مگر رُکن ہونے کے علاوہ میں اس کا مبصر بھی ہوں اور انجمن کے ہر دم بدلتے رنگوں کا جائزہ لینے پر مامور ہوں۔ چنانچہ میں نے وقتاً فوقتاً اس شام کے جو رُوپ دیکھے ہیں انہیں اپنے اشعار میں محفوظ کرتا چلا گیا ہوں:

کیا حادثہ ہوا کہ بکھرنے لگی ہے شام
بہرُوپ خشک پھول کا بھرنے لگی ہے شام

ہر ہر قدم پہ میری طرف مُڑ کے دیکھتی
زینے سے پتھروں کے اُترنے لگی ہے شام

کاسے آفتاب سے بھر کر لہو کا جام
دامانِ آسماں پہ اُلٹنے لگی ہے شام

آنسو، ستارے، جگنو، لرزتے ہوئے چراغ
لاکھوں چمکتی کرچوں میں بٹنے لگی ہے شام

صدیوں کے اک سفر سے جو لوٹی تو بے طلب
میری سیہ قبا میں سمٹنے لگی ہے شام

یہ شام، یہ "شامِ دوستاں" ہر روز دن کی گرم مٹھی سے نکل کر میری طرف اڑتی ہے اور میری سیہ قبا میں سمٹ جاتی ہے یا شاید میں زمانے کی گرفت سے نکل کر چند لمحوں کے لئے اس کی قبا میں سمٹ جاتا ہوں۔ کون جانے؟
